ایک پیار اسا یا ہی

بلقیس ظفر

I

دراصل یہ سارا قصور وسیم میاں کی پھوپھی اماں کا تھا۔ جنہوں نے خط ڈالنے کی خدمت انجام دینے کے عوض ازراہ کرم اسے ایک عدد اٹھنی عطا فرمادی تھی۔ وسیم نے حیرت سے انہیں دیکھا اور پھر اٹھنی کو۔۔۔۔۔۔ گویا کہہ رہا ہو اسے کیا کروں۔

"رکھ لو بیٹا" پھوپھی اماں نے اس کے تذبذب کو دیکھ کر پچکارتے ہوئے کہا۔

"کھٹی مٹھی گولیاں خرید لینا۔ یا کوئی اور چیز۔۔۔۔۔۔"

وسیم کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ کتنے ہی دن سے وہ کھٹی مٹھی گولیاں خریدنا چاہ رہا تھا۔ مگر امی نہیں خریدنے دیتی تھیں۔

"گلا خراب ہو جائے گا" اس کی استدعا کے جواب میں انہوں نے ڈانٹ دیا تھا۔

اٹھنی کو احتیاط سے نیکر کی جیب میں رکھ کر وہ باہر نکلا۔ اور کچھ سوچتا' بے سری سیٹی بجاتا (جو اس نے بھائی جان سے سیکھی تھی) وہ یعقوب پان والے کی دوکان کی طرف چلا۔ جہاں کھٹ مٹھی گولیوں کے مرتبان بھی بھرے رکھے تھے۔ چند منٹ وہ باہر کے شوکیسوں میں سے ان کی بہار دیکھتا رہا۔ پھر اندر چلا گیا۔

"آٹھ آنے کی کھٹ مٹھی گولیاں دے دو" اس نے بڑی خود اعتمادی اور قدرے غرور سے کہا۔ آج اس دکان کی ہر شے اپنی لگ رہی تھی۔ اور جب دکان دار نے زمرد جیسی سبز اور یاقوت جیسی سرخ چمک دار گولیوں کا پیکٹ اس کی طرف بڑھایا تو پیسے ادا کر کے دو گولیاں اس نے تمہید کے طور پر منہ میں ڈالیں اور باہر آگیا۔

ابھی وہ چند قدم ہی چلا تھا کہ بھائی جان آتے ہوئے مل گئے۔

"ارے وسیم۔ تم کدھر پھر رہے ہو" انہوں نے بشاشت سے کہا۔

"چلو پکچر دیکھنے چلو گے؟ گلوب پر بڑی اچھی پکچر آئی ہوئی ہے۔"

"پکچر؟" ---- مارے حیرت کے وسیم کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ بھائی جان نے آج تک ایسی فیاضی نہ دکھائی تھی۔۔۔۔۔ آج تو معلوم ہوتا ہے کہ قدرت اس پر خاص طور سے مہربان تھی۔

"ہاں ہاں۔۔۔۔۔۔۔۔ امی سے پیسے لے آیا ہوں" بھائی جان نے جیب کھنکھنائی۔

"چلنا ہو تو چلو۔۔۔۔۔۔۔۔"

"ضرور چلوں گا" وسیم نے مسرت سے چہک کر کہا۔

اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ رشوت اور احسان مندی کے طور پر اس نے ایک عدد گولی بھائی جان کو پیش کی۔

"نہ بھئی۔۔۔۔۔ میں نہیں کھاتا۔۔۔۔۔" انہوں نے بڑی لاپروائی سے کہا۔ وسیم حیران رہ گیا۔ بھلا ایسی مزے دار چیز کھانے سے بھی کوئی انکار کر سکتا ہے۔

پکچر واقعی بہت دلچسپ تھی۔ کاؤ بوائیز گھوڑوں پر چڑھے اپنے اپنے ہولسٹروں سے پستول نکال نکال کر لوگوں پر فائر کرتے پھر رہے تھے۔ چند ایک رومانٹک سین بھی تھے۔ جنہیں وسیم نے خاص طور پر دلچسپی سے دیکھا۔ اس میں ایک بے ہنگم سا لڑکا' ایک پھولدار فراک والی گول مول سی لڑکی کو کچھ پھول پیش کرتا ہے آگے کیا ہوا۔ یہ وسیم کو یاد نہ رہا۔ البتہ یہ پھول دینے والا سین جیسے ذہن میں جم کر رہ گیا۔

یہ یقینی کوئی بہت اچھی بات ہوتی ہو گی جبھی تو وہ لڑکی اتنا ہنسی تھی۔ بہت خوش ہوئی تھی وہ۔ خواہ مخواہ ہی وہ مسکرانے لگا۔

پکچر کے دوران بھائی جان نے حاتم کی قبر پر لات مارتے ہوئے ایک پیکٹ تلے ہوئے آلوؤں کا لے لیا تھا۔ وسیم اسے ختم کرنے کے بعد پھر گولیوں پر جٹ گیا۔ آخر پکچر ختم ہوئی۔ اور لوگوں کے ہجوم میں دھکے کھاتے' دوسروں کو دھکیلتے یہ بھی نکل آئے۔

بھائی جان تو آموں والی سڑک کا موڑ مڑنے سے پہلے ہی اپنے کسی دوست سے ملنے چل دیئے۔ اور وسیم' پکچر کے خیالات میں غرق' گولیاں چوستا' آہستہ آہستہ گھر روانہ ہوا۔ چلتے چلتے کاؤ بوائیز کی نقل میں اس نے دوڑنا شروع کر دیا۔ اور جیب میں سے پنسل نکال کر اسے پستول کی طرح پکڑے ہوا میں فائر کرنے لگا۔ چونکہ یہ خود ساختہ پستول "ٹھا ٹھا" کی آواز نہ نکال سکتا تھا۔ اس لئے مجبوراً یہ کام اسے منہ سے لینا پڑا۔

اس شان میں زنانے سے گھر کے گیٹ میں داخل ہوا تو بدقسمتی سے سب سے پہلی مڈبھیڑ ابا سے ہوئی۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے" انہوں نے اس کے دھکے سے بمشکل سنبھلتے ہوئے ڈانٹ کر کہا۔۔۔۔ "کیا بالکل جنگلی ہو گئے؟"

وسیم کے قدم جیسے زمین نے پکڑ لیے۔ پنسل والا ہاتھ آہستہ آہستہ نیچے ہو گیا' وہ گولی چوسنی بھی بھول گیا تھا۔ بچاری سہمی ہوئی سی منہ کے ایک کونے میں پڑی رہ گئی۔

"کیا ہو رہا تھا یہ؟" ابا جان نے غرا کر پوچھا۔

"کچھ نہیں ابا جان - وہ پکچر میں....." وہ ہکلایا گھبراہٹ میں ہونٹوں پر زبان پھیری جو طرح طرح کے رنگوں میں رنگی ہوئی تھی۔

"یہ تم کھا کیا رہے ہو؟" ابا جان قریب آ گئے۔ "زبان نکالو۔۔۔۔۔" اسے نا چار تعمیل کرنا پڑی۔

"گولیاں؟" وہ گرجے "کتنی مرتبہ تم سے کہا ہے۔ یہ کھٹ مٹھی گولیاں مت کھایا کرو۔ پھر نہیں مانے؟"

"ابا جان۔ مجھے پھوپھی جان نے اٹھنی دی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ....."

"بکو مت" انہوں نے غصے سے کہا۔ "نکالو گولیاں جیب سے" وسیم اس ناانصافی پر سخت رنجیدہ تھا۔ دل ہی دل میں اس ظلم پر احتجاج کرتے ہوئے اس نے آہستہ آہستہ ساری گولیاں نکال کر ابو کی ہتھیلی پر رکھ دیں جنہیں انہوں نے کمال سنگدلی سے احاطے کی دیوار کے باہر پھینک دیا۔ جہاں جھاڑیاں تھیں اور کیچڑ تھا۔ وسیم کو ابا کی ناقدری پر بہت افسوس ہوا۔ ہائے کیسی خوب صورت گولیاں تھیں جو انہوں نے پھینک دیں - وہ منہ لٹکائے وہاں سے جانے لگا تو ابا جان نے پھر تنبیہہ کی۔

"آئندہ یہ گندی اور سڑی ہوئی گولیاں مت کھانا۔"

"اونہہ سڑی ہوئی۔" وہ دل ہی دل میں بڑبڑایا "اتنی تو خوب صورت اور پیاری ہیں..... ...ابا جان اندر چلے گئے تو وہ ادھر ادھر دیکھتا بڑی خاموشی کے ساتھ احاطے سے باہر نکل گیا۔ اور نہایت دلجمعی سے ایک ایک کر کے ساری گولیاں جھاڑیوں میں سے ڈھونڈ لیں اور بڑی احتیاط سے انہیں دوبارہ جیب میں رکھ لیا۔ پھر ادھر ادھر دیکھتا جا کر اپنی اور ساتھ والی کوٹھی کی مشترکہ دیوار پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ منہ کے اندر مٹی میں سنی ایک گولی تھی۔

"بلی" اس نے آہستہ سے پکارا۔ ایک دو دفعہ آواز دینے پر ساتھ والے پڑوسیوں کی ننھی سی لڑکی سرخ فراک پر سرخ ربن باندھے بھاگتی ہوئی آئی۔

"ارے وسیم۔ تم کیا کر رہے ہو ادھر؟" اس نے قریب آتے ہوئے کہا۔

"بس یونہی بیٹھا ہوں" اس نے ٹھنڈا سانس بھر کر کندھے اچکائے ابا جان کی ناانصافی پھر یاد آ گئی تھی۔

"کھا کیا رہے ہو؟" بلی نے پوچھا۔

"گولیاں" اس نے خوش ہو کر کہا "کھاؤ گی؟"

بلی نے سر ہلا دیا اور وسیم نے دو گولیاں نکال کر اس کی اوپر اٹھی ہوئی ہتھیلی پر رکھ دیں۔

"یہ تو.....یہ تو مٹی میں سنی ہوئی ہیں۔" بلی نے قدرے ہچکچا کر کہا۔

"تو کیا ہوا۔ پونچھ لو۔" وسیم نے مشورہ دیا" ذرا سی مٹی ہے اتر جائے گی" بلی نے فوراً اس مشورے پر عمل کیا۔ اور اپنے نفیس فراک کے دامن سے مٹی پونچھ کر گولی منہ میں ڈال لی۔

"اور لو گی"؟ آج وسیم کی فیاضی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اور بلی کے جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے ڈھیر ساری گولیاں اسے تھما دیں۔ اچانک اسے پکچر کا پھول یاد والا سین یاد آ گیا۔

"بلی۔ تمہارے لئے پھول توڑ دوں؟" اس نے بالکل بے ہنگم لڑکے جیسی مدھم، کھرج کے سروں والی آواز نکالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"اونہوں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔مگر وسیم یہ تمہاری آواز کو کیا ہوا۔ گلا خراب ہے؟" بلی نے تشویش سے پوچھا۔

"ہاں" وہ قدرے مظلومیت سے بولا۔ پکچر کا خیال ذہن سے اتر گیا تھا۔

"تو پھر ڈاکٹر سے دوائی کیوں نہیں لیتے؟" بلی نے فکر مند ہو کر پوچھا۔ اسے یوں پریشان دیکھ کر وسیم بہت محظوظ ہو رہا تھا۔ خواہ مخواہ ہی اپنی اہمیت کا احساس ہونے لگا تھا۔

"لے لوں گا" اس نے ٹانگیں ہلاتے ہوئے بے نیازی سے کہا۔

اتنے میں بلی کی امی کی آواز آئی۔ وہ اسے پکار رہی تھیں۔

"اچھا وسیم خدا حافظ۔۔۔۔۔۔۔۔۔" وہ گولیاں نگلتے ہوئے بولی۔

"میں پھر آؤں گی۔۔۔۔۔۔۔۔۔اور دیکھو" وہ بھاگتے بھاگتے رکی۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

اپنے گلے میں دوائی ضرور لگوا لینا۔"

"اچھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔" وہ لاپروائی اور قدرے غرور سے بولا۔ لگوا لوں گا۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

اور بدستور ٹانگیں جھلاتا ہوا کچھ سوچنے لگا.....

اچانک اسے فلم کا ایک سین یاد آ گیا جس میں ایک بڈھا سا پینٹر دروازوں کے پرانے پینٹ کو اتارنے کے لئے۔۔۔۔۔۔۔ ایک نادر نسخہ استعمال کرتا ہے۔ اس نسخے کے یاد آتے ہی وسیم کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ واہ کیا عمدہ طریقہ تھا۔ اسے یاد آیا کہ بڈھا پینٹر ایک ہاتھ میں کوئی ٹارچ نما چیز لئے اس پینٹ کو گرم کرتا تھا اور دوسرے ہاتھ کے چاقو سے کھرچ کر اتار دیتا تھا۔ وسیم نے روزمرہ کی زندگی میں کبھی یہ حیرت انگیز نسخہ استعمال ہوتے ہوئے نہ دیکھا تھا۔ لیکن اسے یقین تھا کہ فلم والا یہ طریقہ پرانا پینٹ نکالنے کے لئے لاجواب تھا۔ اس نے گھر کے پرانے فرسودہ پینٹ والے دروازوں کو اوور ہال کرنے کی ٹھان لی۔ دیوار پر سے اترا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اور اپنا

جیبی چاقو کھول کر آہستہ سے اندر چلا گیا۔

اس کے ابا کلیم صاحب رات کو دیر سے گھر آئے۔

"اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ صبح سر میں درد تھا نا۔؟ امی نے سویٹر بنتے بنتے ہولے سے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں" جھلائے ہوئے لہجے میں کلیم صاحب نے جواب دیا۔ اور دھم سے کرسی میں بیٹھ گئے۔

"ایک تو اس لڑکے سے جان ضیق میں ہے۔ عجیب عجیب حرکتیں کرتا ہے" انہوں نے ٹوپی اتارتے ہوئے کہا۔

"کون؟" امی سویٹر بنتے بنتے رک گئیں۔

"وسیم اور کون۔۔۔۔۔۔۔۔۔" وہ بیزار ہو کر بولے " صبح میں اکرام صاحب کے ہاں جا رہا تھا تو گیٹ میں گولی کی طرح آ کر میرے ساتھ ٹکرایا پوچھا۔ تو فرمانے لگے میں پستول چلانے کی پریکٹس کر رہا تھا۔ اور پستول پتہ ہے کون سا تھا۔؟ ایک پنسل۔ انہوں نے ٹھنڈی آہ بھر کر منہ پھیر لیا۔ بڑی لڑکی روبینہ کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ آ گئی جسے چھپانے کے لئے وہ کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ اتنے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔

"خدایا۔ ایک تو اس کم بخت فون سے جان عذاب میں ہے" کلیم صاحب نے سر تھام کر کہا۔ "جاؤ بیٹا جا کر دیکھو کون ہے۔"

روبینہ پہلے ہی گیلری میں چلی گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد آئی۔ تو امی نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"امی۔ ہماری پڑوسن کامنز تنویر کا فون تھا" وہ بولی۔ "کیا کہتی تھیں" امی نے پوچھا۔

وہ کہہ رہی تھیں وسیم نے نہ جانے منھی بلی کو کیا کھلا دیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ جو گلا بیٹھ گیا ہے۔ بچاری بات تک نہیں کر سکتی۔ بڑی پریشان تھیں کہ شہر میں فلو پھیلا ہوا ہے۔ کہیں بچی کو نہ ہو جائے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ وسیم کو منع کریں کہ ایسی چیزیں نہ کھایا کرے۔"

کلیم صاحب کرسی میں سیدھے ہو بیٹھے " معلوم ہوتا ہے کہ کم بخت گولیاں اس نے کہیں سے ڈھونڈ نکالیں ورنہ میں تو انہیں پھینک آیا تھا۔" انہوں نے گویا خود سے کہا۔

"کون سی گولیاں" امی حیران رہ گئیں۔ مگر کلیم صاحب نے اس کی بات جیسے سنی ہی نہیں۔ اور اپنی کہتے رہے" میں کہتا ہوں اسے پاگل خانے میں داخل کرا دو۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اس لڑکے کا دماغ خراب ہو چکا ہے۔"

امی بے بسی سے بیٹھی انہیں دیکھ رہی تھیں۔ پھر آہستہ سے بولیں۔

"بچہ ہے' خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔"

"فی الحال تو میں اسے ٹھیک کرنے جا رہا ہوں" کلیم صاحب دانت پیس کر بولے "ہے کہاں وسیم۔۔۔۔۔۔۔۔"

"ابا جان ابھی میں نے دیکھا تھا آپ کے بیڈ روم کے دروازے پر کھڑا تھا" روبینہ نے سہم کر کہا۔

اور وسیم واقعی وہیں تھا۔ گزشتہ آدھ گھنٹے کے دوران اس بے انتہا جانفشانی سے جلتی ہوئی موم بتی اور چاقو کی مدد سے دروازے کے روغن کا بیشتر حصہ کھرچ ڈالا تھا۔ اور اب بقیہ پینٹ کھرچنے کے ساتھ یہ سوچ سوچ کر خوش ہو رہا تھا کہ جب نیا پینٹ اس دروازے پر کیا جائے گا تو کتنا پیارا لگے گا۔۔۔۔۔۔۔۔!

کوئی ایک گھنٹہ بعد۔ وسیم پائیں باغ میں بیٹھا سوچ رہا تھا کٹھی مٹھی گولیاں کھانا' پنسل کو پستول بنا کر چلانا' یا پرانے دروازوں کا گندہ پینٹ کھرچ کر اتار دینا' اتنا بڑا جرم تو نہ تھا جس کی سزا ایسی سخت دی جاتی ہے ..... ٹھوڑی کے نیچے اپنے گدبدے ہاتھ رکھے اس نے افسوس سے سر ہلایا اور ایک سرد آہ بھر کر گھاس کے تنکے نوچ نوچ کر کھانے لگا۔ وہ اپنے والدین کے غلط رویے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ یعنی ایک تو اس نے اچھا کام کیا۔ ننھی بلی کو اپنی اچھی چیز میں سے حصہ دیا۔۔۔۔۔۔۔۔ لیکن ابا کہتے ہیں تم نے سخت بد تمیزی کی جو اسے گولیاں کھلائیں۔ ہونہہ۔ خود ہی تو کہتے ہیں۔ اپنی چیز میں سے دوسروں کو حصہ دینے سے ثواب ہوتا ہے۔ ان کی غلط بیانی پر سخت رنجیدہ ہو کر اس نے سر جھکا لیا۔

اندر کمرے میں کلیم صاحب اور ان کی بیگم کی بحث جاری تھی۔

"میں کہتا ہوں اس کے دماغ کا معائنہ کراؤ" کلیم صاحب نے صوفے پر مکہ مار کر کہا "حد ہو گئی ہے۔ دروازے کا نیا پینٹ کھرچ ڈالا اور.....اور۔۔۔۔۔۔۔۔" وہ غصہ سے ہکلانے لگے۔ بیگم کلیم نے آہستہ سے اون کا گولہ ٹوکری میں رکھا اور ایک طرف سرکاتے ہوئے نرم لہجے میں بولیں "آپ ٹھیک کہتے ہیں' ہے تو پاگل پن' مگر بچے سبھی ایسے ہوتے ہیں آپ اس اتنا اثر نہ لیا کریں" یہ کہہ کر وہ وقار سے اٹھ کھڑی ہوئیں اور کھڑکی کے قریب جا کر پکارا۔

"وسیم بیٹے اندر آ جاؤ۔ شام ہو رہی ہے۔"

وسیم رنجیدہ صورت بنائے اندر آ گیا اپنے بیڈ روم میں جاتے ہوئے اس نے ابا اور امی کو شب بخیر کہا۔۔۔۔۔۔۔۔ کیا فائدہ دل میں غصہ رکھنے سے۔ اس نے بڑی فراخدلی سے سب ظالموں کو معاف کر دیا۔ اور سونے چلا گیا۔

2

"امی جان وہ غزالہ ہے نا۔ ماجد کی بہن" بڑے بیٹے نعیم نے قدرے ہکلاتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "وہ جو....."

بیگم کلیم اطمینان سے اون کا گولہ لپیٹتی رہیں۔ اور خاموش رہیں۔ البتہ وسیم نے جو ایک طرف بیٹھا تھا کان کھڑے کر لئے۔

"بھائی جان۔ وہ لمبی سی لڑکی جو آپا سے ملنے آیا کرتی ہے۔؟ اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

"تم چپ رہو۔" نعیم نے ڈانٹا" جاؤ باہر جا کر کھیلو۔"

مگر وسیم اتنی جلدی ٹلنے والی اسامی نہ تھا۔ وہیں بیٹھا رہا۔ البتہ منہ دوسری طرف کر لیا۔

نعیم نے اپنی رہی سہی ہمت مجتمع کی اور پھر سے کہنا شروع کیا

"امی! آپ نے دیکھا تو ہے اسے۔وہ....."

"بیٹے۔ یہ تم جرابوں میں اتنے بڑے بڑے سوراخ کیسے کر لیتے ہو؟"

بیگم کلیم نے بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ "روزانہ رفو کرنا پڑتا ہے انھیں۔"

نعیم نے بے چینی سے پہلو بدلا "امی جان سنئے تو سہی آپ....."

"تو کہو نا۔ میں سن رہی ہوں" وہ بولیں۔

"امی جان وہ ماجد کی بہن ہے۔ آپ نے کئی مرتبہ دیکھا ہے اسے۔ ابھی پچھلے ہفتے ہمارے گھر آئی تھی۔ وہ لمبی سی گوری سی....."

"یہ سب کچھ تم مجھے پہلے بھی بتا چکے ہو۔ اب آگے چلو" بیگم کلیم نے لاپروائی سے کہا۔

نعیم سٹپٹا گیا۔ ادھر ادھر دیکھ کر اس نے لمبی سانس لی۔ اور پھر سے کہنا شروع کیا۔ "امی جان! انہوں نے کئی دفعہ ہم بہن بھائی کو چائے پر بلایا ہے۔ میں چاہتا ہوں کسی دن ہم بھی انہیں اپنے ہاں مدعو کریں وہ بہت اچھے لوگ ہیں۔ بے حد نفیس اور....."

"میں جانتی ہوں" امی نے دل ہی دل میں اس کی گھبراہٹ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا" اچھا بلا لینا انہیں کسی دن۔"

"میری اچھی امی" نعیم ان سے لپٹنا چاہتا تھا مگر وسیم کو متوجہ پا کر رک گیا۔ "دیکھئے امی جان اسی اتوار کو بلانا ٹھیک رہے گا؟ اچھا میں ابھی جا کر ماجد کو فون کرتا ہوں اور امی .....ایک بات اور۔"

"کہو"۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ صبر سے بولیں

"کچھ پیسے دیجئے میں جرابوں کا نیا جوڑا اور ایک ٹائی خریدنا چاہتا ہوں۔ میری پاکٹ منی ختم ہو گئی ہے۔"

"اچھا دے دوں گی۔" وہ مسکرائیں۔

"بہت بہت شکریہ امی جان" نعیم کا چہرہ مسرت سے چمک رہا تھا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا" ابھی تو دینو سے کہہ کر بوٹوں کو پالش کروانا ہے۔ اسے کہوں گا خوب چمکا دے انہیں۔ کم بخت روزانہ تو بس بے گار ہی ٹالتا ہے۔ ہونہہ۔ جوتے ایسے ہونے چاہیں کہ ان میں چہرہ نظر آئے۔ اور ہاں۔ امی جان میں نے بنیان بھی خریدنی تھی۔"

"اچھا بھائی خرید لینا وہ بھی" امی نے اپنی روایتی نرمی سے کہا۔

"اور اب خیر سے سدھارو۔"

نعیم کمرے کے درمیان کھڑا کچھ سوچنے لگا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اس کی نظریں وسیم پر گڑی تھیں۔ اچانک وہ مڑا اور پاس آکر سرگوشی میں بولا۔" اور امی اس وسیم کو ہٹا دیجئے گا بہت بدتمیزی کرتا ہے لوگ کیا خیال کریں گے۔"

"ہٹا دوں گی مگر غریب کو چائے تو اپنے پاس ہی پلا لینا" وہ بولیں۔

"اچھا مگر خیال رکھئے گا۔ ہمارے پاس نہ بیٹھنے پائے" یہ کہہ کر مطمئن سروں میں سیٹی بجاتا نعیم باہر نکل گیا۔

اتوار کے روز صبح ہی امی نے وسیم کو ہدایات دے دیں کہ بڑے بہن بھائیوں میں مت جا کر بیٹھنا بلکہ اپنے ہم عمر بچوں سے کھیلنا' البتہ چائے تم ان لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر پی سکتے ہو۔ مگر وہ بھی بڑی تمیز اور سمجھ داری کے ساتھ۔ کوئی بے ہودگی نہ کر بیٹھنا وسیم کو اپنی توہین تو بہت محسوس ہوئی۔ مگر وہ چپکا ہو رہا۔ اور نہایت سعادت مندی سے ساری ہدایات کو ذہن نشین کر لیا۔

مہمانوں کے آنے کا وقت ہو رہا تھا۔ جب وہ آوارہ پتے کی طرح ڈولتا ہوا باغ میں جا نکلا۔ اسے سختی سے منع کر دیا گیا تھا کہ جب وہ لوگ آئیں تم سامنے نہ ہونا۔ لہٰذا وہ سوچ رہا تھا کون سا ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جو وہ خود مہمانوں کو دیکھ لے۔ مگر وہ لوگ اسے نہ دیکھ سکیں۔

اچانک روش کی گنجان جھاڑیاں دیکھ کر اس کا چہرہ کھل اٹھا بس ٹھیک ہے۔ یہاں چھپ کر ان لوگوں کو دیکھیں گے۔ مگر ابھی کافی وقت پڑا تھا۔ اس وقت کو کیسے گزارا جائے۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ یک لخت اسے فلم کا ریڈ انڈین یاد آیا۔۔۔۔۔۔۔۔ جو چہرے پر طرح طرح کی گلکاری

کئے' بالوں میں پر اڑسے' ہاتھ میں تیر کمان لئے مزے سے ادھر ادھر گرجتا پھرتا تھا۔ واہ۔ بس ریڈ انڈین بنیں گے ہم بھی۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ سوچ کر وہ باورچی خانے میں کھسک گیا تاکہ باورچن کی آنکھ بچا کر تھوڑی توے کی کالک' اور ڈرم میں پھینکے ہوئے مرغی کے کچھ پر' چپکے سے اڑائے جا سکیں۔

ادھر ڈرائنگ روم میں نعیم میاں کی بے چینی قابل دید تھی۔ نئی ٹائی باندھے' بوٹ چمکائے' نئے موزے پہنے وہ ادھر سے ادھر ٹہل رہا تھا۔ کبھی جا کر۔۔۔ بینا کو ڈانٹتے کہ ڈرائنگ ٹیبل پر تازہ پھول نہیں لگوائے۔ کبھی باورچن کے سر ہوتے کہ پھلکیاں جلدی تلو' بیگم کلیم اس ساری دوڑ بھاگ سے دور اوپر والی منزل میں بڑے سکون کے ساتھ اپنے کمرے میں بیٹھی کام میں مصروف تھیں۔ کلیم صاحب حسب دستور اس اتوار کو بھی اپنے دوست انوار علی صاحب سے ملنے گئے ہوئے تھے۔

آخر جب کوئی بہترویں بار میاں نعیم اپنی گھڑی کو دیکھ چکے تو باہر کار کے ہارن کی آواز سنائی دی۔ وہ جلدی سے بال ٹھیک کرتے ہوئے باہر لپکے پیچھے پیچھے بنیا تھی۔

اپنی خوب صورت گلابی قمیض کے شکن درست کرتی غزالہ اکیلی ہی کار سے برآمد ہوئی۔ تو دل میں خوش ہوتے ہوئے' بظاہر قدرے فکر مند شکل بنا کر نعیم نے پوچھا "اور ماجد نہیں آئے۔"

"نہیں"۔۔۔۔۔۔۔ غزالہ نے محبوبانہ بے اعتنائی سے جواب دیا ان کا اپوائنٹ منٹ لیٹر آگیا تھا۔ وہ آج صبح کی فلائٹ سے پشاور چلے گئے ہیں۔ اس لئے میں تنہا ہی آئی ہوں۔۔۔۔۔۔۔ ارے یہ کون" وہ رکی۔۔۔۔۔۔۔۔ اس کی نظر جھاڑیوں میں آدھی چھپی ہوئی ایک عجیب و غریب صورت پر پڑی تھی۔۔۔۔۔۔ وہ ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ نعیم کا خون خشک ہو گیا۔ اس لئے کہ جھاڑیوں کی چلمن میں سے جس نصف چہرے نے جھانک کر دیکھا وہ ان کے پیارے بھائی وسیم کا تھا۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ انہوں نے اسے پہچان لیا۔ ورنہ ایک ایسی صورت کو پہچاننا قدرے مشکل ہی تھا جس نے سیر بھر کالک چہرے پر تھوپ رکھی ہو۔۔۔۔۔۔۔۔ بالوں میں مرغی کے سیاہ سفید پر لگے ہوں اور کندھے پر بوری اٹکا رکھی ہو۔

"وسیم" بینا کے منہ سے نکلا۔

اور غزالہ خلاف توقع کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"اچھا تو یہ وسیم صاحب ہیں۔ باہر نکلو کاکو بوائے۔"

"میں کاکو بوائے نہیں۔۔۔۔۔۔۔۔ ریڈ انڈین چیف ہوں" وسیم نے باہر نکل کر قدرے

برامان جانے کے انداز میں کہا۔

" اچھا جناب سردار صاحب " غزالہ نے قدرے جھک کر اسے تعظیم دیتے ہوئے کہا" کیا حال چال ہیں"۔

وہ اس صورت حال سے بڑی لطف اندوز ہو رہی تھی۔ اس کا اپنا کوئی چھوٹا بھائی نہیں تھا۔ اور وہ ننھے شرارتی بچوں کی دیوانی تھی۔ نعیم پیچھے کھڑا غصے سے لال پیلا ہو رہا تھا۔ مگر قہر درویش برجان درویش اس کی موجودگی میں کیا کہتا۔ آخر اس نے قدرے ہمت کر کے کہا۔

"اندر آجایئے آپ۔ اور وسیم تم جا کر منہ ہاتھ دھو کر انسانوں جیسی شکل بنا کر آؤ۔۔۔۔۔۔"

"نہیں وسیم۔ مت دھونا۔ ہاتھ منہ"۔ غزالہ نے پیار سے کہا۔

"تم اسی طرح بہت پیارے لگ رہے ہو۔۔۔۔۔۔۔۔"

اور نعیم کا دل چاہا وسیم کا یہی " پیارا پیارا" کالک لگا منہ مارے تھپڑوں کے لال کر دے۔ یہ ہمیشہ اسی طرح رنگ میں بھنگ ڈالتا ہے۔ غصے اور بے بسی سے ایک نظر اس نے بینا پر ڈالی۔ گویا تم ہی کوئی امداد کرو۔ بینا اس کی نظروں کے مفہوم کو سمجھ کر آگے بڑھی۔

"آؤ غزالہ ۔۔۔۔۔۔۔۔ اندر چل کر بیٹھیں۔ اور ریڈ انڈین چیف " اس نے دلار سے وسیم کو مخاطب کر کے کہا۔ " آپ ذرا جا کر شکار کھیلیں۔"

وسیم ایک ریڈ انڈین سردار کی طرح اکڑتا ہوا۔۔۔۔۔۔ اپنا شیشم کی کچی شاخوں سے بنا ہوا تیر کمان لٹکائے درختوں کی طرف چلا گیا اور نعیم نے اپنے سوکھے ہوئے لبوں پر زبان پھیر کر ایک دفعہ پھر اپنے بالوں کو ٹھیک کیا اور اطمینان کی سانس لی۔

"منہ ہاتھ دھو کر چائے کے وقت ڈرائنگ روم میں آجانا" بینا نے جاتے جاتے پکار کر کہا۔ اور وسیم بڑے پر وقار انداز سے "اچھا" کہہ کر ادھر ادھر چڑیاں تاکنے لگا۔

چائے پر حسب وعدہ وسیم بھی موجود تھا۔ مگر اس وقت اس کا چہرہ دھلا ہوا اور بال برش سے خوب جمے ہوئے تھے۔ اپنی براؤن پینٹ اور سرخ قمیض میں وہ بہت مہذب لگ رہا تھا۔ نعیم اس کی موجودگی سے پھر ایک بار جھلا گیا۔۔۔۔۔۔ مگر غزالہ کو انتہائی توجہ اور پیار سے اس کے ساتھ باتیں کرتے دیکھ کر خاموش ہو رہا۔ غصے اور رنج کی وجہ سے اس وقت کوئی دل کش بات بھی اس کے دماغ میں نہیں رہی تھی۔ اور وہ ہزاروں باتیں تو گویا پر لگا کر اڑ گئی تھیں۔ جو اس نے اس زریں موقع کے لئے سوچ رکھی تھیں۔ مایوسی، غصے اور بے بسی سے اس کا برا حال تھا۔ ادھر وسیم تھا کہ ہنس ہنس کر مستقل باتیں کیے جا رہا تھا اور غزالہ وہ بے وقوف لڑکی۔ اس کی

بے سروپا گپوں اور انتہائی کمینی باتوں پر یوں ہنس رہی تھی جیسے اس سے زیادہ اچھی اور مزے دار باتیں اس نے کبھی سنی ہی نہ ہوں۔

آخر خدا خدا کر کے چائے تمام ہوئی۔ اور سب اٹھ کھڑے ہوئے تو وسیم نے ایک طرف ہو کر۔۔۔۔۔۔ ایک ایسی سرگوشی میں جو سارے کمرے میں گونج گئی، بینا سے کہا" آپا۔ میں بھی بھائی جان کی طرح نئی جرابیں اور ٹائی لگا آؤں؟"

غزالہ نے ہنس کر نعیم کی طرف دیکھا۔ اور نعیم کا جی چاہا زمین میں گڑ جائے۔ مگر گڑنے سے پہلے اس باجی کو قتل کر کے روحانی سکون حاصل کر لے۔

بینا بھی قدرے شرمندگی سے ہنس پڑی۔ اور آنکھوں ہی آنکھوں میں وسیم کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ مگر وسیم۔۔۔۔۔۔۔۔ بالکل انجان بن گیا۔ اور اشارے کو قطعی نظر انداز کر کے غزالہ کے پاس صوفے پر جا بیٹھا۔ مجبوراً نعیم کو دوسرے قریبی صوفے پر جگہ سنبھالنی پڑی۔ بینا بڑی عقلمندی سے پہلے ہی کہیں کھسک گئی تھی۔

"کیا آپ کتابوں کو شائق ہیں" بڑی کوشش سے غصے کو نگل کر نعیم نے غزالہ کو مخاطب کیا" میرا مطلب ہے کہانیاں وغیرہ کس مصنف کی پسند ہیں آپ کو.....؟

مگر غزالہ کے جواب دینے سے پہلے وسیم بول پڑا۔

"میں نے ایک دفعہ خود کہانی لکھی تھی" اس نے ہمک کر کہا۔

" بڑی اچھی تھی۔ اگر آپ اسے پڑھتیں تو بہت خوش ہوتیں۔ وہ ایک ڈاکو کی کہانی تھی۔ اس نے کچھ ہیرے اور سونا چرایا تھا پھر وہ ایک جہاز پر چڑھ گیا۔ مگر جہاز سمندر میں ڈوب گیا پھر ایک مچھلی نے سارے ہیرے کھا لئے۔ اور بادشاہ نے اسے پکڑ لیا۔ اور....."

" ہائے کتنی مزیدار کہانی ہے" غزالہ گویا نعیم کا دل جلانے پر تلی ہوئی تھی آج۔ مگر نعیم اس ننھے باجی سے کیوں کر ہار مان لیتا۔ کھنکار کر اس نے ایک نیا موضوع چھیڑا۔

"مس حیدر۔ آپ کو پھول کون سا پسند ہے؟"

وسیم کی گول مٹول آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ تالی بجا کر وہ بولا" باجی۔۔۔۔۔۔۔۔ میری کیاری میں بڑے اچھے پھول ہیں!"

"ڈیلیا۔ گل داؤدی اور کتا پھول۔ بڑے خوب صورت رنگ برنگے آپ کو دکھاؤں؟"

اب نعیم سے صبر نہ ہو سکا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

" آیئے مس حیدر۔ آپ کو گلاب کے تختے دکھاؤں"۔

غزالہ بھی کھڑی ہو گئی "چلئے" اس نے بڑے مہذب انداز میں کہا۔ نعیم نے آنکھ بچا کر

پیچھے مڑ کر وسیم کو سخت سے گھورا۔۔۔۔۔۔۔ مگر وسیم یہ اشارہ سمجھ کر بھی نہ گیا اور بڑی مستعدی سے ساتھ چل پڑا۔

"باجی۔ آپ کو ٹائی کی ایسی ناٹ باندھنی آتی ہے جو جلدی نہ کھلے؟" ۔۔۔۔۔۔ وہ ساتھ ساتھ چلتا ہوا بولا۔

"نہیں بھئی۔ مجھے تو نہیں آتی" غزالہ نے خوشدلی سے ہنس کر کہا۔

"مجھے آتی ہے" وہ غرور سے سینہ پھلا کر بولا۔ "بڑی آسان ہوتی ہے فٹافٹ آجاتی ہے۔ میں آپ کو سکھاؤں گا۔ اور آپ کو وہ راکٹ بنانے بھی سکھاؤں گا جو کاغذ سے بنتے ہیں اور خوب تیز اڑتے ہیں۔ مجھے اور بھی بہت سی چیزیں بنانی آتی ہیں۔۔۔۔۔۔۔ ماچس کی تیلیوں سے....."

غصے کے مارے سرخ ہوتے ہوئے نعیم نے کچھ بولنا ضروری سمجھا۔

"یہ گلاب ابا جان نے پنڈی سے منگائے ہیں" وہ ایک کیاری کے سامنے رکتا ہوا بولا "انہیں ان پر بڑا فخر ہے۔"

"واقعی بڑے خوب صورت ہیں" غزالہ نے پرستائش نظروں سے پھولوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"اور جناب۔ میرے پھول اتنے پیارے ہیں کہ اگر آپ دیکھیں تو حیران رہ جائیں" وسیم پھر بیچ میں آن ٹپکا۔

نعیم نے جلدی سے ایک ادھ کھلی گلاب کی کلی توڑی اور قدرے تذبذب سے غزالہ کو پیش کرتے ہوئے ہکلانے لگا۔

"یہ کلی..... آپ کے بالوں میں سج کر..... میرا مطلب ہے....."

"میں آپ کو اپنے کتا پھول اور چڑیا پھول لا کر دیتا ہوں ابھی۔"

"جوش میں بھر کر وسیم نے کہا اور بھاگتا ہوا کیاریوں میں چلا گیا۔ چنانچہ جب یہ تینوں واپس ڈرائنگ روم میں پہنچے تو نعیم کی دی ہوئی کلی کہیں گر گرا گئی تھی۔ جب کہ غزالہ کے دونوں ہاتھ وسیم کے عطا کردہ "کتا پھول" "گل داؤدی" اور "چڑیا پھول" کی نچی کھسوٹی اور بے ترتیب شاخوں سے لدے ہوئے تھے۔

مگر بینا کے جا کر شکایت کرنے پر بیگم کلیم کو خیال آیا۔ تو وہ خود نیچے آئیں۔ اور دوسرے کمرے میں جا کر وسیم کو اپنے پاس بلا لیا۔ مگر شومئی قسمت سے دونوں کمروں کے درمیان دروازہ تھا۔ چنانچہ جب نعیم نے غزالہ سے مخاطب ہو کر کہا "میرا خیال ہے۔ اب آپ کا یہاں قیام قدرے طویل ہی ہو گا۔؟"

تو ساتھ ہی وسیم کی سرگوشی سارے کمرے میں پھیل گئی "مگر امی میں ان کو کب تنگ کر رہا تھا۔ میں تو صرف....."

"شش' خاموش رہو" امی کی مدھم آواز سنائی دی۔ تو سب کے کان لاشعوری طور پر ادھر لگ گئے۔

نعیم نے بڑی بہادری سے پھر موضوع چنا "اگر کسی دن آپ کو فرصت ملے تو ذرا یہاں کے قابل دید مقامات....."

"مگر امی" وسیم کی سرگوشی گونجی "میں تو صرف باجی سے باتیں کر رہا تھا۔ پھر بھائی جان ....."

نعیم کا چہرہ قرمزی ہو رہا تھا۔ مگر بڑی مشکل سے اس نے خود کو سنبھالا اور کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن غزالہ نے توجہ ہی نہ دی وہ بڑے غور سے وسیم کی سرگوشیاں سن رہی تھی۔

"کیا کوئی اب بولے بھی نہیں۔ ان سے" وسیم کی دبی دبی آواز ابھری۔

"اس لئے کہ بھائی جان منع کرتے ہیں۔ وہ خود ان سے بولنا چاہتے ہیں بھئی....."

سرگوشیوں کا سلسلہ جاری تھا۔ مگر قدرت کو آخر کار نعیم کے صبر پر رحم آ ہی گیا۔ اور غزالہ خود ہی یہ کہہ کر اٹھ گئی کہ دیر ہو رہی ہے اب جانا چاہئے۔

"کسی دن پھر آیئے نا" نعیم نے ہمت کر کے کہہ ڈالا۔

"ضرور آؤں گی۔ وسیم سے ملنے کو میرا دل بڑا چاہتا ہے" غزالہ نے ہنس کر کہا۔ اور نعیم زہر کے سے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ شام کو امی اور بینا کی دلدہی کے باوجود نعیم کے زخم مندمل نہ ہوئے تھے' غضب خدا کا۔ اتنا شان دار موقع اور اس موذی نے تباہ کر دیا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ اپنے بال نوچ کر جنگلوں میں نکل جاتا۔۔۔۔۔۔۔ یہ کم بخت گھر اس قابل نہیں کہ اس میں کوئی شریف آدمی رہ سکیں آخر بینا نے ایک تجویز پیش کی جسے سن کر نعیم کا غم زدہ دل کھل اٹھا۔ یہ ایک پکنک کو تجویز تھی۔ بینا نے سرگوشی میں کہا کہ ہم لوگ اکیلے دریا کے کنارے پکنک منانے جائیں گے۔ امی سے اجازت لے کر۔۔۔۔۔ اور وسیم کو قطعی نہیں لے جائیں گے۔ بلکہ اس سکیم کی ہوا بھی نہ لگنے دیں گے۔

"بس صرف تم ہو گے۔ میں۔ غزالہ' اس کی خالہ جان جن کے پاس وہ آئی ہوئی ہے اور کسی کو نہیں بلائیں گے۔۔۔۔۔۔۔ بینا نے بتایا اور نعیم اس تجویز پر صاد کرتا ہوا مطمئن ہو گیا۔ کہ چلو غزالہ کے قیام کے آخری دن کو ہی یادگار بنالیں گے۔

3

وہ سارا ہفتہ نعیم میاں نے اس طرح بے چینی سے گزارا۔ کہ بس دیکھنے کے قابل تھا۔ اپنی اچھی بھلی صاف پتلون اٹھا کر ڈرائی کلین والے کو دے دی۔ اور ساتھ ہی یہ دھمکی بھی کہ اگر ہفتے کی شام تک اچھی طرح صاف کر کے نہ لائے تو تمہیں پھانسی دے دی جائے گی۔ جوتوں کو اتنا پالش کر دیا کہ اس میں واقعی چہرہ نظر آنے لگا۔ بادرچن کو طرح طرح کی ہدایات دیں۔ گوشت کا حلوہ بینگن کی کھیر' اور نہ جانے کیا کیا الم غلم۔ پکانے کو کہہ دیا۔ آخر اس نے جا کر بیگم کلیم سے شکایت کی کہ صاحبزادے عجیب عجیب چیزیں پکانے کو کہہ رہے ہیں اتوار کے روز۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اور بیگم کلیم کے ڈانٹنے پر نعیم میاں کچن سے ٹلے۔

اور اپنی اس بھاگ دوڑ میں وہ وسیم کو قطعی بھولے ہوئے تھے۔ گویا اس نام کا کوئی فردان کے گھر میں رہتا ہی نہیں۔ ایک روز بازار سے کلام میر کی ایک جلد بھی اٹھا لائے اور اچھے اچھے باموقع شعر اس میں سے چھانٹ کر یاد کر لیے گویا اپنی طرف سے پوری طرح تیار ہو بیٹھے۔

آخر وہ مبارک دن بھی آ پہنچا جب اس سارے قافلے کو پکنک پر جانا تھا غزالہ اور اس کی خالہ سویرے ہی پہنچ گئیں۔ بیگم کلیم نے ایک طرف لے جا کر وسیم کو سمجھا دیا تھا کہ دیکھو۔ سب بڑے ہی جا رہے ہیں پکنک پر۔ بچوں کا وہاں کوئی کام نہیں۔ لہٰذا تمہارا جانا ٹھیک نہیں۔ تم یہیں گھر پر رہو میں نے تمہارے لئے کھانا تیار کرا دیا ہے۔ بادرچن کی بیٹی بیمار ہے وہ چھٹی پر ہے تم اپنا مزے سے کھیلنا۔ کوئی بدتمیزی نہ کرنا۔ البتہ اگر چاہو تو ساتھ والوں کی ننھی سے کھیل سکتے ہو۔

وسیم کی یہ زبردست توہین تھی کہ اسے "بڑوں" کے زمرے سے خارج کر دیا گیا تھا۔ تاہم وہ بڑے وقار سے ہوں ہاں کرتا رہا۔ امی کو تسلی دلائی کہ کوئی شرارت نہیں کروں گا۔

سب لوگ پکنک پر چلے گئے۔ امی اور ابا پہلے ہی کسی کے ہاں مدعو تھے۔ چل دیے۔ اب وسیم صاحب کا راج تھا گھر پر۔ وہ کچھ دیر تو جھاڑیوں میں چھپ کر اپنا من پسند کھیل "ریڈ انڈین" کھیلتا رہا۔ فرضی دشمنوں پر گولیاں چلائیں "شکار" کو نوچا کاٹا خوب منہ پر کالک ملی۔ سر میں مرغی کے پر سجائے اور نہایت حسین شکل بنائے کھیل میں مگن رہا۔ پھر اچانک اسے ان ٹافیوں کا خیال آیا جو گزشتہ ہفتے نعیم بھائی کو ان کے کسی دوست نے دی تھیں۔ وہ مزے سے ٹہلتا ٹہلتا ان کے کمرے میں چلا گیا۔ ٹافیوں کا ڈبہ الماری میں پڑا تھا۔ اس نے نکال کر یونہی دو ایک منہ میں ڈال لیں۔ خاصی مزیدار لگیں۔ تو دو چار اور۔۔۔۔۔۔ پاس ہی میز پر کچھ کاغذ پڑی تھیں وہ انہیں دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ڈبہ خالی پڑا تھا۔

اس نے اٹھ کر آہستہ سے انگڑائی لی۔ ٹافیوں کی بے وفائی پر افسوس کرتا ہوا کمرے کی دوسری دلچسپ چیزوں کی طرف متوجہ ہوا۔ میز پر ایک ٹائم پیس پڑی تھی۔ اسے چابی دیتا رہا۔ آخر اس کے اندر ایک ناگوار سی آواز پیدا ہونے سے میز پر رکھ دیا۔ اب کمرے میں چونکہ کوئی خاص دلچسپی والی چیز نہ رہی تھی اس لئے باہر چلا گیا۔

ادھر ادھر گھومتا گھامتا آخر وہ گیراج کی طرف نکلا گیراج خالی پڑا تھا۔ البتہ اس کے ایک کونے میں نعیم میاں کی وہ نئی سائیکل پڑی تھی۔ جو گزشتہ ماہ ان کی سالگرہ پر ابا جان نے دی تھی۔ اور جس پر چڑھنے کی وسیم کو سخت ممانعت تھی۔

وسیم آہستہ چلتا سائیکل کے پاس جا کھڑا ہوا۔ اف کتنی خوب صورت تھی وہ چمک دار اور بے داغ۔ وہ تحسین آمیز نظروں سے اسے تکتا رہا۔ یوں لگ رہا تھا گویا سائیکل نے اس پر جادو کر دیا ہو۔ آخر کچھ دیر بعد اس نے فیصلہ کیا کہ صرف ہاتھ میں پکڑ کر باغ میں گھمانے سے اسے کچھ نقصان نہ پہنچے گا۔

کچھ دیر اپنے آپ سے کئے ہوئے وعدے کے مطابق وہ سائیکل کو باغ میں گھماتا رہا۔ پھر آہستہ سے ایک جگہ ٹھہرا کر اس پر چڑھنے کی کوشش کی۔ لیکن گر پڑا مگر وسیم ہمت ہارنے والوں میں نہ تھا۔ چار پانچ بار گرنے اور پھر اٹھنے کے بعد آخر کار وہ اس پر چڑھنے میں کامیاب ہو گیا۔ سائیکل پر چڑھ کر اس کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ کچھ عجیب ذمہ داری کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے بڑے غرور سے سائیکل کو دیکھا۔ جس کی چمک دار سیاہ پالش جگہ جگہ سے کھرچی گئی تھی اور مٹی لگ گئی تھی۔ چلو۔ کوئی بات نہیں پونچھ دیں گے۔ یہ سوچ کر اس نے سائیکل کو چلانے کے لئے پیڈل مارنے شروع کئے۔ سائیکل چلنے لگی مگر عجب وضع سے لہریے بناتی ہوئی۔ وسیم بڑی تندہی سے کبھی گلاب کی جھاڑی سے خود کو بچاتا' تو کبھی روش پر لگی ہوئی اینٹوں سے۔ اس طرح وہ سڑک پر نکل آیا۔ اب واپس جانا ممکن نہ تھا۔ لہٰذا وہ سائیکل چلاتا رہا رستے میں ایک لاری آتی دکھائی دی۔ معلوم نہیں کس طرح وسیم نے خود کو ایک طرف کر کے بچا لیا۔ لیکن اب اسے ڈر لگ رہا تھا۔ ادھر سائیکل تھی کہ جادو کے جھاڑو کی طرح خود بخود چلتی جا رہی تھی اور وسیم کو اسے روکنے کا کوئی گر یاد نہ تھا۔ اب وہ نہ جانے کس طرح سڑک پر سے بچ کر گلیوں میں نکل آیا تھا۔ اور گلی کوچوں کے شیطان بچے اس کے پیچھے تالیاں پیٹتے' سیٹیاں بجاتے جلوس کی شکل میں بھاگنے لگے تھے۔

وسیم کی وحشت اور خوف انتہا کو پہنچ چکے تھے۔ مگر سائیکل تھی کہ اڑی جا رہی تھی۔ اب یہ کبھی نہیں رکے گی۔ اس نے خواب کے عالم میں سوچا۔ بس اسی طرح چلتی جائے گی۔ کیا خبر میں اسی طرح سائیکل چلاتا چلاتا امریکہ پہنچ جاؤں -------

ادھر گلی کے لڑکوں کے لئے سیاہ چہرے اور مرغی کے پروں والا۔ "ریڈ انڈین" ------ جو سائیکل پر اڑا جا رہا تھا ایک نہایت دلچسپ نظارہ تھا۔ وہ سمجھتے تھے شاید شہر میں نیا سرکس آیا ہے ۔ اور یہ اس کا جوکر ہے جو تماشے کے طور پر شہر میں گھوم رہا ہے۔

وسیم کے پاؤں مشینی انداز میں پیڈلوں کو حرکت دیئے جا رہے تھے اور اس میں گرنے تک کی سکت باقی نہ رہی تھی۔ اب شہر پیچھے رہ گیا تھا۔ بچے بھی تالیاں پیٹ پیٹ کر تھک چکے تھے اور اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے تھے۔ اب اکیلا وسیم تھا۔ اور اس کی سائیکل۔ جو بے تکان چلتی جا رہی تھی۔ اسے کچھ خبر نہ تھی کہ کہاں جا رہا ہے اور اس کی منزل کدھر ہے۔ مگر قدرت کو معلوم تھا---------!

شہر سے باہر دریا کے کنارے ' ٹھنڈی ٹھنڈی ڈھلوان پر پکنک منانے والوں کی ٹولی بیٹھی تھی۔ موسم نہایت خوشگوار تھا سب قہقہے لگا رہے تھے۔

"ہم نے وسیم کو جل دیا" بینا نے ہنس کر کہا۔

"لیکن بھئی مجھے افسوس ہو رہا ہے" غزالہ نے کہا "اگر وسیم ہوتا تو کتنا مزا آتا----------"

کتنا خوبصورت موسم ہے "نعیم نے جلدی سے کہا" چلئے بوٹنگ کریں۔

غزالہ اور بینا نے بھی اس تجویز پر صاد کیا کشتی منگائی گئی کچھ دیر دریا کی سیر کرتے رہے ۔ پھر کنارے پر آ گئے ۔ اس دوران نعیم کے دماغ میں ان کے الفاظ نے ہلچل مچائے رکھی مگر وہ غزالہ سے کچھ بھی نہ کہہ سکا' کنارے پر پہنچ کر پکنک کا سامان ٹوکریوں سے نکالا گیا۔ بینا نے جلدی سے نیچے رگ بچھایا اور سامان خورد و نوش اس پر سجا دیا--

اور عین اس وقت جب نعیم نہایت ادب سے غزالہ کی خدمت میں کبابوں کی پلیٹ پیش کر رہا تھا۔ ایک عجیب و غریب ہیولا سامنے سڑک پر سائیکل چلاتا نظر آیا۔ اس کا چہرہ بالکل سیاہ تھا۔ بالوں میں پر اڑسے ہوئے تھے (جن میں سے کچھ گزشتہ مہم کے دوران گر چکے تھے۔) کندھوں پر پنوں سے اٹکایا ہوا ایک پرانا دری کا ٹکڑا تھا۔ جو ہوا کے زور سے لہراتا آ رہا تھا۔ یہ نظارہ دیکھ کر سب کے منہ حیرت سے کھلے کے کھلے رہ گئے نعیم کے لبوں سے ایک بے آواز 'کنگناہٹ سی نکلی۔

وہ ہیولا نزدیک آگیا تو سب کے منہ سے بے یک وقت نکلا "وسیم۔"

سڑک ختم ہو چکی تھی آگے دستر خوان بچھا تھا۔ وسیم کی بے قابو سائیکل پیسٹریوں' کبابوں' سموسوں' اور کیلوں وغیرہ پر سے ہوتی ہوئی سیدھی دریا میں جا گری'

بڑی دقت سے وسیم کو مع سائیکل کے باہر نکالا گیا۔ سب بڑے پریشان تھے-------وہ بالکل بھیگ کر چوہا ہو رہا تھا۔ مگر خود کو ہیرو تصور کر رہا تھا۔ لہٰذا بشاشت چہرے سے پھوٹی پڑ رہی تھی غزالہ نے پیار سے گود میں لٹا کر اس کا سر تھپتھپانا شروع کیا۔ وسیم مزے سے چمکتا رہا۔ اپنی دن بھر کی کارگزاریاں سناتا رہا۔ سب کی ہمدردیاں اس کے ساتھ تھیں۔ اور نعیم میاں الگ بیٹھے انگلیاں چٹخا رہے تھے۔ قسمت یہاں بھی اس کے خلاف رہی۔

4

وسیم کا موڈان دنوں بالکل آف ہو رہا تھا۔ کیونکہ کچھ روز سے دنیا والوں سے اس کے تعلقات سخت کشیدہ تھے۔ اور وہ عوام الناس میں کچھ خاص پاپولر نہ رہا تھا۔ غزالہ جو اس کی خوب وکالت کرتی تھی۔ واپس چلی گئی تھی۔ ادھر محض کھلونے کی وجہ سے گھر کی فضا اس کے خلاف ہو رہی تھی۔ معمولی سا کھلونا تھا بس خواہ مخواہ ہی سب اس کے پیچھے پڑ گئے تھے۔ حالانکہ انہیں اس کاریگری کی داد دینا چاہیے تھی جس سے وہ حسین کھلونا بنایا گیا تھا۔ یہ ایک بطخ نما بیلون تھا۔ جس میں گتے کے پر وغیرہ لگے تھے۔ جب اس میں ہوا بھری جاتی۔ تو یہ ایک سوراخ کے ذریعے آہستہ آہستہ نکلتی جس سے عجیب بھیانک آواز پیدا ہوتی۔ وسیم کو اس کی شرارت میں خاص لطف آتا تھا۔۔۔۔۔۔ صبح وہ بیلون میں ہوا بھر کر اسے کھانے کی میز کے نیچے چھپا کر مزے سے بیٹھ گیا اور پھر آہستہ سے اس کی ہوا نکالنی شروع کی اس کی بھیانک آواز سے گھبرا کر امی کے ہاتھ سے چائے کی پیالی گر گئی۔ بینا کی چیخ نکل گئی۔ ابا جان بے اختیار کرسی سے کھڑے ہو گئے اور نعیم بھیا باہر بھاگے کہ شاید کوئی سائرن وغیرہ بج رہا ہے ادھر وسیم نہایت معصوم شکل بنائے بیٹھا سب کی گھبراہٹ سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ آخر اس کی ضرورت سے زیادہ معصومیت پر سب کو شک گزرا۔ ڈھنڈیا پڑی تو "آلہ قتل" برآمد کر لیا گیا۔ خوب ڈانٹ پڑی کہ خبردار جو کبھی اس منحوس کھلونے کو یہاں لائے تو۔۔۔۔۔۔ وسیم کو اس لفظ "منحوس" پر اعتراض تھا۔ تاہم خیریت اسی میں سمجھی کہ چپ چاپ اسے لے کر کھسک جائے۔ ویسے اس سارے معاملے میں وہ خود کو بالکل بے قصور سمجھتا تھا۔ بھلا بنانے والے نے ہی اسے اس طرح بنایا تھا تو وہ کیا کرے۔ کوئی اس نے تھوڑی بنایا تھا اسے۔

خیر۔۔۔۔۔۔ سکول جاتے ہوئے وہ اسے ساتھ لیتا گیا۔ رستے میں راہ گیروں کو اس کی آواز سے ہائی جمپ کرواتا مزے سے سکول پہنچ گیا۔ وہاں جا کر کلاس روم میں اپنے ڈیسک کے اندر چھپا دیا۔ فری پیریڈ میں اسے پھلا لیتا اور عین پڑھائی کے وقت اس کی آواز بھرنے کی نالی کھول دیتا۔ بڑی شان دار آواز نکلتی حساب کے ماسٹر صاحب انگریزی کے استاد' غرض کسی سے بھی یہ عقدہ حل نہ ہوا کہ آواز کہاں سے آتی ہے۔ آخر اردو کے ماسٹر صاحب نے اپنی ذہانت سے پتہ چلا لیا۔۔۔۔۔۔ کھلونا برآمد ہوا۔ اور بچی سکول ضبط کر لیا گیا۔

دوپہر کے کھانے پر وسیم کی شکل دیکھ کر ابا مسکرانے لگے۔

"معلوم ہوتا ہے سکول والوں نے وہ کم بخت کھلونا تم سے چھین لیا ہے۔"

"جی"۔۔۔۔۔۔ سخت رنجیدہ ہو کر وسیم نے اعتراف کیا۔ ساتھ یہ بھی کہا کہ بعض لوگوں کو ابھی تک پتہ نہیں ہے کہ کسی کی چیز لے لینے کو چوری کہتے ہیں وہ اپنے استادوں کے چال چلن کے بارے میں سخت متفکر تھا۔

"چلو خیر۔ بلا ٹلی" ابا نے اطمینان کا سانس لیا۔ وسیم نے قدرے ملامت آمیز انداز سے ان کو دیکھا اور ہونٹوں میں کچھ ناقابل فہم الفاظ بڑبڑانے کے بعد خاموش ہو گیا۔

سہ پہر کو تھوڑی سی پڑھائی کرنے کے بعد اس نے اطمینان سے کہانیوں والی کتاب کھول لی جو آج ہی اس کے ایک ہم جماعت نے دی تھی۔ جس میں ایک ایسے ہیرو کا بیان تھا جو گھر والوں کے سلوک سے دل برداشتہ ہو کر گھر سے بھاگ جاتا ہے۔۔۔۔۔۔ سمندری جہاز پر نوکری کر لیتا ہے اور بے شمار سونا کماتا ہے۔ آخر میں وہ گھر واپس آ کر اپنے تمام رشتہ داروں کو معاف کر دیتا ہے اور انہیں بہت سا سونا عطا کرتا ہے۔۔۔۔۔۔ یہ کہانی وسیم کو بہت پسند آئی البتہ اس کے آخری باب سے اسے کچھ اختلاف تھا۔ گھر سے بھاگ جانا اور سونا کمانا بڑے دلچسپ کام تھے۔ مگر رشتہ داروں کو معاف کر دینا اور سونا دینا۔۔۔۔۔۔ اونہوں۔ وہ قطعی ایسی غلطی نہیں کرے گا۔ نہ کسی کو معاف کرے گا نہ سونا دے گا۔

ہاں اگر زیادہ گڑگڑائیں گے تو ایک ایک ٹکڑا سب کو دے دے گا۔ زیادہ نہیں اور بینا آپا کو تو بالکل نہیں دے گا۔ بھلا کیوں دے وہ ظالم لوگوں کو۔۔۔۔۔۔ اور جب وہ بہت دولت مند ہو جائے گا تو ایک پورا کمرہ سیٹی بجانے والے بیلونوں اور بگلوں سے بھر دے گا اور انہیں سارا دن خوب بجائے گا۔ اس کے علاوہ سارے گھر میں سفید چوہے اور سنڈیاں اور گھونگے بھر دے گا۔ جن سے یہ سب لوگ چڑتے ہیں اور ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور سارا دن گندے بوٹوں میں پھرا کرے گا۔ بے شمار موٹریں رکھے گا۔ اور ان سب لوگوں میں سے کسی ایک کو بھی ان پر چڑھنے نہیں دے گا۔ آہا کتنا مزا آئے گا پھر۔۔۔۔۔۔ وہ دیر تک بیٹھا یہ حسین خواب دیکھتا رہا۔ اور اٹھتے وقت دل میں تہیہ کر لیا کہ جلد سے جلد گھر سے بھاگ جاؤں گا۔ دوسرے روز شام کو جیب میں بیلون ڈالے وہ تیز قدموں سے سڑک پر چلا جا رہا تھا۔ یہ بیلون اس نے مزے سے اردو کے ماسٹر صاحب کی میز پر سے اڑا لیا تھا۔

آخر کیوں نہ لیتا وہ۔۔۔۔۔۔ اور اب وہ دنیا کی سیاحت پر اپنے خوابوں کو عملی جامہ پہنانے نکل کھڑا ہوا تھا۔ اس نے سوچا رات تک میں ضرور ساحل سمندر تک پہنچ جاؤں گا۔ وہاں سے کسی جہاز پر نوکری کر کے سونا کماؤں گا۔ اور اگلے ہفتے تک واپس آ جاؤں گا۔ اف۔

لوگ کتنے حیران ہوں گے اسے اتنا امیر کبیر دیکھ کر ------ پھر وہ سکول تو قطعی نہیں جایا کرے گا- البتہ سوچنے کی بات یہ تھی کہ اپنی دولت میں حصہ دار کس کس کو بنانا چاہیے- ایک تو اپنے پیارے ہم جماعت فرید کو بہت سا سونا دوں گا- اس نے سوچا جس نے اچھی دولت کمانے والی کہانیوں کی کتاب دی تھی- دوسرے اپنے ہاں کے بوڑھے مالی کو- ہائے ہائے کتنا غریب ہے بے چارہ- اور پوسٹ مین- وہ بھی تو بہت اچھا ہے- اور بجلی ٹھیک کرنے والا مستری- بس ان سب کو بہت سارا سونا دوں گا- اور کسی کو نہیں سکول ماسٹروں اور گھر والوں کو تو ایک چونی بھی نہیں دوں گا- بس- جیسا ان لوگوں نے سلوک کیا ہے ویسا ہی وہ ان کے ساتھ کرے گا-

سڑک لمبی ہوتی جا رہی تھی- اس نے قدرے فکر مند ہو کر سوچا کہ ساحل تو ابھی تک آیا ہی نہیں وہ شارٹ کٹ کی خاطر ایک نئے نئے جوتے ہوئے کھیت میں ہو لیا- مگر یہ رستہ بہت دشوار ثابت ہوا- نرم نرم مٹی بوٹوں میں بھر گئی- بار بار پاؤں بھر بھری زمین میں دھنس جاتے- ادھر شام تھی کہ رات میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی- وسیم کے جوش و خروش میں کچھ کمی آ گئی- تاہم وہ چلتا رہا اسے یاد آیا کہ کہانی کے ہیرو نے رستہ میں ایک دو جگہ بھیک مانگ کر گزارہ کیا تھا- کیوں نہ وہ بھی بھیک مانگ کر پیٹ بھر لے- کیوں کہ زیادہ چلنے کی وجہ سے اب بھوک لگ آئی تھی- لیکن مصیبت یہ تھی- کہ آس پاس کوئی گھر نہ تھا- جہاں سے بھیک مانگی جا سکتی-

آخر کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد اسے سڑک کے کنارے لوہے کے گیٹ والا ایک گھر نظر آیا- اس نے فوراً چہرے پر فقیروں جیسی مسکنت طاری کر لی- اور دروازے پر جا کر دستک دی-

تھوڑی دیر بعد ایک موٹے تازے آدمی نے آ کر دروازہ کھولا- حلیے سے وہ گھر کا ملازم نظر آتا تھا-

"کیوں بے کیا ہے؟" اس نے ڈانٹ کر پوچھا-

"دیکھئے ....." وسیم نے کہنا شروع کیا ہی تھا- کہ آدمی نے بے صبری سے ہاتھ ہلا کر کہا "اگر تم نئے نوکر ہو- تو اس دروازے سے آؤ- ورنہ دفع ہو جاؤ- یہ کہہ کر اس نے دروازہ بند کر دیا- وسیم وہاں کھڑا کچھ سوچتا رہا- پھر اس نے یہی فیصلہ کیا کہ "نیا نوکر" بن جانا چاہیے- یہ عمدہ بہر حال بھیک مانگنے سے زیادہ معزز تھا- اس نے دوسری طرف جا کر دروازہ کھٹکھٹایا- دروازہ کھولنے والی ایک لحیم شحیم عورت تھی جس نے چھینٹ کا کرتہ پہن رکھا تھا-

"کون ہے رے"؟ اس نے پوچھا-

وہ آدمی کہتا تھا- وسیم نے ہاتھ ہلا کر کہا "کہ اگر تم نئے نوکر ہو- تو اس طرف سے آؤ ------"

"تو سامنے والے گیٹ پر چلا گیا تھا؟" وہ حیران ہو کر بولی "اچھا یہ بتا تیرا سامان کدھر ہے ؟"

"آ رہا ہے" وسیم نے بغیر جھجکے کہا-

"تو کھد کیوں نہیں لے آیا رے؟" وہ ہنسی اڑانے والے انداز میں بولی-

"بڑا نوابزادہ معلوم ہووے ہے --------"

وسیم خاموشی سے اندر چلا آیا- کچن خاصا روشن اور فراخ تھا- ایک چھوٹے سے قد کی نوکرانی ایک طرف بیٹھی آلو چھیل رہی تھی- دوسری ملازمہ جو کافی خوش لباس تھی- گیس کے چولہے پر کھڑی ہنڈیا بھون رہی تھی- دونوں نے مڑ کر اسے دیکھا-

"گلشن یہ نیا نوکر ہے" موٹی ملازمہ نے انہیں بتایا" رمضانی نے انہیں ادھر بھیجا ہے-

"خوش لباس باورچن نے غور سے کیچڑ بھرے بوٹوں سے لے کر اس کے بکھرے بالوں تک دیکھا اور ناک بھوں چڑھا کر رائے دی "گندا سا چھوکرا ہے-"

اور وسیم نے دل ہی دل میں اس عورت کو سونا لینے والوں کی فہرست سے خارج کر دیا-

چھوٹے قد والی نوکرانی نے ہنس کر اسے اپنے پاس بلایا" تو نے چائے پینی ہے رے"

وسیم نے بڑے وقار سے سر ہلایا- اور دل ہی دل میں خوش ہو کر اسے بہت سا سونا بخش دیا-

"اچھا آ ادھر" اس نے پچکار کر اسے پاس بٹھا لیا- اور ایک تام چینی کے کپ میں چائے انڈیل کر دی- ساتھی ہی صبح کے بچے ہوئے اپنے حصے کے کچھ توس بھی دے دیئے- وسیم کھانے پر ٹوٹ پڑا- اسے اس جنگلی پن سے کھاتے دیکھ کر خوش لباس ملازمہ نے پھر ناک بھوں چڑھائی-

"چڑیا گھر سے آیا وا معلوم ہوتا ہے-"

مگر وسیم نے اس کا قطعی کوئی نوٹس نہ لیا اور کھانے میں جٹا رہا- اتنے میں رمضانی بھی آ گیا-

"بیٹا جی" وہ اس سے مخاطب ہوا" اب کبھی آؤ- تو اس دروازے سے آنا- ادھر والا گیٹ صاحب لوگوں کے لئے ہے اور یہ ہم نوکروں وغیرہ کے لئے-

وسیم نے اسے ایک لمحے کے لئے گھورا- اور خاموش رہا- ایسے بدتمیزوں کی بات کا جواب دینا وہ کسر شان سمجھتا تھا-

رمضانی نے حقارت سے زمین پر تھوکا اور کہنے لگا- "بس یہ سارے ----- ایک جیسے ہوتے ہیں کھاؤ پیر- جب دیکھو تب ٹھونس رہے ہوتے ہیں اور کام کے نام پر میامرتی ہے- وہ پچھلا لڑکا مجیدو بھی ایسا ہی تھا- یہ بھی ایسا ہی لگتا ہے- کام چور نوالہ حاضر ----- کیوں بے تجھے

بھی کھانا اچھا لگتا ہے۔ اور کام برا۔؟"

"لو۔ دیکھ لو" رمضانی نے گویا فریاد کی۔

پستہ قد والی نوکرانی ہنسنے لگی۔ اور خوش لباس ملازمہ نے اسے گھور کر دیکھا۔

"اچھا نباب صاحب" رمضانی نے طنزاً کہا "اگر آپ نے کھانا ختم کر لیا ہو۔ تو چلو آپ کو وردی دے دوں ان میلے میلے کپڑوں اور کیچڑ تھپے بوٹوں سے اگر تم صاحب کے سامنے گئے تو وہ نکال باہر کریں گے ------"

وسیم خاموشی سے اس کے ساتھ چل دیا۔ ایک چھوٹے سے کمرے میں جا کر رمضانی نے ایک نیکر اور کوٹ پر مشتمل اسے وردی عطا کی۔ وسیم نے جھٹ اسے پہن لیا۔

"یہ تجھے ذرا ڈھیلی ہے" رمضانی نے ناقدانہ نظروں سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا "پر کوئی بات نہیں کھا کھا کر تو بھی موٹا مسٹنڈا ہو جائے گا تو پوری آجائے گی۔ اچھا دیکھو ------ کوٹ کے بٹن مت توڑیو -------- چل اب میرے ساتھ ------ اور تیرا سامان کون لائے گا۔؟

"ایک .....ایک دوست" وسیم نے بتایا۔

دونوں واپس کچن میں پہنچے۔ تو رمضانی نے اسے پینٹری میں دھکیل دیا۔

یہاں کام کرنا ہے تجھے - اے رفیقن کچھ چمچے' چھری کانٹے اس لونڈے کو دے دیجو۔ صاف کر دے گا۔ میں اب جا رہا ہوں" ذرا سی دیر میں اسے چمچے' چھری کانٹے اور انہیں صاف کرنے کا پوڈر تھما کر پینٹری کا دروازہ بند کر دیا گیا۔

"اس لڑکے کی شکل ایسی بد ذات ہے کہ یہ ضرور کوئی نہ کوئی مصیبت کھڑی کرے گا" خوش پوش ملازمہ نے اپنا دوپٹہ ٹھیک کرتے ہوئے ناک چڑھائی۔

"وہ کیوں" -------- چھوٹے قد کی نوکرانی گلشن نے آلوؤں کا تھال ایک طرف رکھ کر سنک میں ہاتھ دھوتے ہوئے پوچھا۔ "گھنا تو مجھے بھی لگے ہے" موٹی نوکرانی نے کہا۔

بات چیت کے اس مرحلے پر وسیم کے پوڈر تھپے چہرے نے پینٹری سے جھانکا۔

"میں نے کچھ چمچے صاف کر لیے ہیں باقی پھر کر لوں گا۔ اب باہر آ جاؤں ؟"

"تم نے کتے صاف کیے ہیں" موٹی نوکرانی نے پوچھا۔

"ایک ---- نہیں نہیں ------ دو ہیں۔" وسیم نے چمچے گنتے ہوئے جواب دیا۔

ہاں دو ہی ہیں۔ لیکن اب میں تھک گیا ہوں ------" موٹی نوکرانی نے آگے بڑھ کر ڈانٹا۔" چل صاف کر سارے۔"

وسیم نے بہتری اسی میں سمجھی کہ سر اندر کر لے "اچھا" اس نے صلح کن انداز میں کہا اور

دروازہ بند کر لیا۔

"دیکھا ----- ؟ یہ حال ہے" خوش پوش ملازمہ رفیقن نے افسوس کے لہجے میں کہا۔ مگر پستہ قد نوکرانی گلشن ایک طرف منہ کیے ہنس رہی تھی۔ اسے ان گھاگ قسم کے ملازموں کو تنگ کر کے خود ہمیشہ بہت لطف حاصل ہوتا تھا۔ اور اب وسیم اس کام کو باحسن طریق انجام دے رہا تھا تو اس کی مسرت کی انتہا نہ تھی۔ ذرا سی دیر میں پھر وسیم کے چہرے نے دروازے کی درز میں سے جھانکا۔

"بھلا رات کا کھانا کس وقت تیار ہوتا ہے تمہارے ہاں ؟" اس نے پوچھا وہ چائے وائے کب کی ہضم ہو چکی تھی۔

اس پر گلشن کو ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔

"ری تو کیوں ہنستی ہے" رفیقن نے ڈانٹا۔ "جا کام کر اپنا" گلشن ہنستی ہوئی برتن دھونے میں لگ گئی۔ موٹی ملازمہ نے پینٹری میں جھانکا۔ تاکہ وسیم کی کارگزاری دیکھے وہ مزے سے میز پر بیٹھا ٹانگیں ہلا رہا تھا۔ سامنے چھری کانٹوں اور چمچوں کا ڈھیر لگا تھا -------- پانی میں گھلا ہوا پوڈر کچھ میز پر گرا پڑا تھا کچھ چمچوں وغیرہ پر لگا تھا اور بقیہ وسیم کے چہرے پر تھپا ہوا تھا۔ شاید اس نے اسے چکھا بھی تھا کیوں کہ زبان پر بھی کوئی سفید سفید چیز نظر آ رہی تھی۔

موٹی نوکرانی نے سر پیٹ لیا۔

"ارے تو تو پاگل ہے" اس نے اندر آتے ہوئے کہا "یہ کیا ناس مارا پوڈر کا نگوڑمارے؟"

اس نے ساری چھریاں کانٹے چمچے اس سے چھین لیے اور غصے میں بھر کر خود صاف کرنے لگی۔ ساتھ ساتھ بڑبڑا رہی تھی۔

"آج مہمان آ رہے ہیں اور ذرا اس کے نخرے تو دیکھو ------ اتنے میں باہر گھنٹی بجی۔ رمضانی کی بھاگ دوڑ سے معلوم ہو رہا تھا کہ شاید مہمان آ گئے ہیں۔

گلشن جلدی سے ٹرے صاف کر کے ٹرالی میں لگانے لگی۔ رفیقن نے کھانا گرم کرنا شروع کر دیا۔

وسیم مزے سے بیٹھا یہ ساری چہل پہل پینٹری کے دروازے میں سے دیکھتا رہا ------ دنیا اسے کافی حسین معلوم ہو رہی تھی۔ اتنے میں رمضانی ہانپتا کانپتا اندر داخل ہوا۔

"کھانا تیار ہے کہ نہیں ؟" وہ ہکلایا۔ پھر اس کی نظر وسیم پر پڑی۔

"ارے یہ ادھر کو بیٹھا کیا کر رہا ہے ؟"

"پوڈر کھا رہا ہے نگوڑا اور کیا کرنا ہے اس نے" موٹی نوکرانی نے ناک چڑھا کر کہا۔

"ادھر کو آ چھو کرے" رمضانی نے پکارا "اس وقت اور کوئی کام تو تیرے کرنے کا نہیں ----- ذرا بیٹھ کے جوتے پالش کر دے"۔

"اچھا" وسیم نے مستعدی سے کہا اور میز سے اتر آیا۔ اسے یقین تھا بوٹ پالش کرنے کا کام اتنا بور ثابت نہیں ہو گا جتنا یہ چمچے چھریاں وغیرہ صاف کرنے کا تھا۔

ذرا دیر میں رمضانی نے اسے ڈھیر سارے بوٹ' سلیپر وغیرہ لا دیئے۔ ساتھ براؤن اور کالی پالش کی ڈبیاں اور برش بھی تھے۔ وسیم بڑے انہماک سے پالش کرنے بیٹھ گیا۔ رمضانی نوکرانیوں سے گپیں لڑانے لگا۔ مہمان پر تبصرہ ہو رہا تھا۔

"صاب کے کوئی دوست ہیں۔ بڑے شان دار آدمی دکھے ہیں پر ہیں گنجے"

پھر وہ وسیم کا کام دیکھنے پینٹری میں آ گیا۔ اس نے بہت سی پالش ایک برش پر چپڑ رکھی تھی اور جوتے سامنے رکھے بیٹھا سوچ رہا تھا کس کو لگاؤں۔ کچھ پالش ہاتھوں اور منہ پر بھی لگی تھی۔

"رے یہ تیرے بٹنوں کو کیا ہوا؟" رمضانی نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ٹوٹ گئے" وسیم نے لاپروائی سے کہا۔

"میں تو پہلے ہی کہتا تھا" رمضانی نے سر ہلا کر کہا "وہ پہلے چھوکرے نے دو دن میں سارے بٹن توڑ ڈالے تھے۔ تو اس سے زادہ تیز نکلا۔ آج ہی غارت کر دیئے۔"

واپس کچن میں آ کر رمضانی نے بڑے رنج سے یہ اطلاع سب کو دی اور کہا "بس کھاتے رہتے ہیں سارا دن اور بٹن توڑتے رہتے ہیں بد ذات چھوکرے ۔ اور کوئی کام ہی نہیں آتا ان سے۔"

اب سوپ تیار ہو گیا تھا۔ رمضانی اسے لے کر باہر چلا گیا۔ ادھر وسیم اب بوٹوں سے بھی اُکتا گیا تھا۔ کچھ دیر ان سے کھیلتا رہا۔ ان کی قطاریں بنائیں۔ سب کے اوپر خوب ڈھیر سی پالش لیپ کر ڈبیاں خالی کر دیں۔ اب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کہ کیا کرے اچانک اسے اپنا بیلون یاد آیا۔ اور اس کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔

رمضانی اور موٹی نوکرانی سوپ کے پیالے لے کر واپس آ رہے تھے کہ اچانک ایک تیز اور بھیانک آواز کچن میں گونج اٹھی۔ نوکرانی کے منہ سے چیخ نکلی اور سوپ کے پیالوں والی ٹرے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ رمضانی پہلے تو منہ اور آنکھیں پھاڑے ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ پھر اسے جائے واردات کا اندازہ ہو گیا۔

پینٹری کا دروازہ کھول کر وہ اندر گھسا تو وسیم بڑے اطمینان سے ایک ہاتھ میں پالش والا

برش اور دوسرے میں پھولا ہوا بیلون لئے کھڑا تھا۔ جس میں سے آہستہ آہستہ ہوا خارج ہو کر وہ بھیانک آواز پیدا کر رہی تھی۔ غصے کے مارے رمضانی کا برا حال ہو گیا۔

"ارے بدذات چھوڑ اس کم بخت بیلون کو۔ ورنہ ....." الفاظ ابھی اس کے منہ میں ہی تھے۔ کہ ایک اضطراری حرکت کے ماتحت وسیم نے دوسرا ہاتھ بڑھا کر وہ پالش بھرا برش اس کے منہ پر رگڑ دیا۔

ایک دو سیکنڈ تو رمضانی دم بخود کھڑا رہا۔ پھر چھپٹا وسیم پر مگر وہ کہاں ہاتھ آنے والا تھا۔ دروازے میں سے نکل کر کمروں میں بھاگنے لگا۔

ادھر ڈائننگ روم میں صاحب خانہ مع اپنی بیگم کے معزز مہمان کے ساتھ بیٹھے کھانے کے انتظار میں باتیں کر رہے تھے۔

"بیگم کیا نیا نوکر آ گیا" صاحب خانہ نے پوچھا۔

"میں نے لقمان صاحب سے کہا تھا آج ہی بھیج دیں۔"

"جی ہاں۔ پہنچ گیا ہے" بیگم نے جواب دیا۔

"اچھا بھی ہے کہ نہیں" انہوں نے پوچھا۔

"رمضان کو تو پسند نہیں آیا" بیگم نے ہنس کر کہا "لیکن خیر اس کو تو آج تک کوئی لڑکا پسند آیا ہی نہیں۔"

"اللہ تعالیٰ نے یہ نئی پود بھی عجب بنائی ہے" معزز مہمان بولے۔

"اور خصوصاً یہ نو عمر لڑکے۔ خدا کی پناہ میرا بھی ایک بیٹا ہے اور ماشاء اللہ جب وہ گھر میں ہو۔ کسی فرد کو سکون اور اطمینان نصیب نہیں ہو سکتا۔ باہر چلا جائے تو گھر کا چین واپس آ جاتا ہے" میزبان ہنسنے لگے "میرا دل چاہتا ہے آپ کے شرارتی بیٹے سے ملوں" -------

وہ بولے "نعیم سے تو میں ایک دفعہ ملا تھا" مگر....."

"آپ اس سے کسی روز مل ہی لیں گے آس پاس کا کوئی آدمی ایسا نہیں جس سے وہ ایک آدھ بار ملا نہ ہو" میزبان نے سنجیدگی سے کہا "خدا کی مہربانی سے اس کا یہ فیض عام ہے۔ ویسے ذاتی طور پر میں یہ بہتر سمجھوں گا۔ کہ آپ اس سے نہ ملیں" اتنے میں چوکیدار ایک چٹھی لے آیا اور مودبانہ طور پر بیگم صاحبہ کو پیش کی۔

"مسز لقمان کی طرف سے ہے" انہوں نے شوہر کو بتایا " لکھتی ہیں مجھے افسوس ہے۔ نیا نوکر جو میں آپ کو بھیجنے والی تھی اسے آج فلو ہو گیا ہے۔ لہٰذا نہیں آ سکے گا۔ جب ٹھیک ہو جائے گا۔ تو بھیج دوں گی۔ امید ہے آپ خیال فرمائیں گی ------"

"لیکن وہ تو پہنچ چکا ہے" انہوں نے حیران ہو کر کہا۔

اتنے میں باہر سے کچھ غصیلی چنگھاڑوں اور بھاگنے دوڑنے کی آوازیں آئیں۔

"یہ رمضانی ہے" بیگم صاحبہ نے حیرت سے کہا "مگر کس سے لڑائی ہو گئی جو یوں چیخ رہا ہے کہیں....."

اتنے میں دروازہ پھٹاک سے کھلا۔ اور ایک لڑکا' جس کے منہ پر پوڈر اور پاش کے دھبے تھے ----- ایک ہاتھ میں پھولا ہوا غبارہ اور دوسرے میں برش لیے اندر گھس آیا۔ پیچھے پیچھے رمضانی تھا جس کا چہرہ غصے اور دوڑ دھوپ کی وجہ سے سرخ ہو رہا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ پاش لپی ہوئی ہونے کی وجہ سے تھوڑا سا ہی نظر آتا تھا۔ لڑکا بھاگ کر میز کے دوسرے کنارے پہنچ گیا۔ مگر فرش چونکہ انتہائی چکنا اور پھسلواں تھا۔ اس لئے پھسل کر گرا۔ گرتے گرتے اس نے بچاؤ کے لئے نزدیک ترین کرسی کو پکڑ لیا۔ جو اتفاق سے مہمان کی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ معزز مہمان 'کرسی سمیت نیچے آ رہے۔ فرش پر گرے ہوئے دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور حیرت سے گنگ ہو کر رہ گئے۔

"وسیم" آہستہ آہستہ اٹھتے ہوئے مہمان نے کہا۔ ان کی آواز بیٹھی ہوئی سی تھی۔

"اوہ -------" لڑکے کے منہ سے نکلا -------- "یہ تو ابا جان ہیں۔"

5

گزشتہ آدھ گھنٹے سے اپنے روشن کلاس روم کے ڈیسک پر بیٹھا وہ شدت سے بیزار ہو رہا تھا۔ سامنے سیاہ رنگ کے بلیک بورڈ پر لکھے ہوئے حروف آپس میں گڈ مڈ ہو گئے تھے۔ اور مطلب خاک بھی اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔ ادھر مس خان بھی سمجھاتے سمجھاتے تنگ آ چلی تھی۔

"دیکھو وسیم" اس نے تھکے ہوئے انداز میں ایک بار پھر کوشش کی۔

"اگر ایک سو روپے پر ایک سال کا سود پانچ روپے ہے تو.....دیکھو سیدھی طرح بیٹھو' ورنہ پڑو گے۔"

وسیم پہلو بدل کر بیٹھ گیا۔

دیکھیں مس یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ بھلا لوگ دوسرے لوگوں کو روپیہ کیوں دیتے پھرتے ہیں۔ اس میں کون سی عقل مندی ہے کہ آدمی دوسرے کو پورے ایک سو روپے دے دے۔ اس لیے کہ وہ ہر سال پانچ روپے اسے دیتا رہے....."

اونہہ۔ میں تو کبھی اس طرح نہ کروں۔ کیا پتہ وہ آدمی جس کو ہم نے سو روپے دیئے ہیں وہ یہ رقم واپس ہی نہ کرے۔ بھلا وہ کیوں واپس کرنے لگا جب پورے سو روپے اس کے پاس ہیں۔ بھئی اس کی مرضی ہو دے۔ مرضی ہو نہ دے اور....."

"خاموش" مس خان نے اپنا دبلا پتلا ہاتھ اٹھا کر اسے چپ کرایا اور پھر تحمل سے بولی "دیکھو وسیم ------ فرض کرو۔ عمران کو کچھ روپوں کی ضرورت ہے اور تم اسے سو روپے دیتے ہو تو....."

"کیوں ------- میں کیوں دوں عمران کو سو روپے؟" وسیم نے غصے سے کہا میرے پاس تو ہیں ہی نہیں۔ بس تین آنے ہیں میرے پاس یہ بھی میں عمران کو کبھی نہیں دوں گا۔ ایک دفعہ میں نے اسے اپنا ماؤتھ آرگن دے دیا تھا تو اس نے دانتوں سے اسے چبا لیا اور....."

مس خان کا ضبط اب جواب دیتا جا رہا تھا "دیکھو۔ تم یوں کرو وسیم کلاس کے بعد مجھ سے ملنا۔ میں سوال سمجھا دوں گی"۔

وسیم ماتھے پر شکنیں ڈالے چپ ہو گیا کچھ دیر یونہی اداس بیٹھا رہا اچانک اسے اپنی چھپکلی یاد

آئی جو سکول آتے ہوئے رستے میں جھاڑیوں سے پکڑی تھی اور اس کا چہرہ کھل اٹھا اس نے دھیرے سے ہاتھ ڈال کر اپنی جیب کو ٹٹولا۔ جہاں بے چاری چھپکلی ننھے منھے پتھروں ' چاقو' لٹو' بسکٹ کے چورے اور کھٹی مٹھی گولیوں کے درمیان دم سادھے پڑی تھی وسیم نے چپکے سے نیم مردہ چھپکلی کو نکالا اور بلاٹنگ پیپر میں لپیٹ کر اپنے ہمسائے کی دوات میں ڈال دیا جس نے بڑے زور وشور سے احتجاج کیا۔ مگر سرگوشیوں میں ------ اور چھپکلی اٹھا کر ساتھ والے لڑکے کے کالر میں ڈال دی۔

ادھر مس خان بڑے انہماک سے سود کے سوالات سمجھا رہی تھی۔ آخر گھنٹہ بج گیا۔ لڑکے ایک ایک کر کے کلاس روم سے نکل گئے۔

"وسیم۔ تم ٹھہرو" مس خان نے ہاتھ کے اشارے سے اسے ٹھہرالیا گو اس کا دل ذرا نہیں چاہ رہا تھا کہ اس وقت بیٹھ کر پڑھے جب اس کے ہم جماعت چھٹی کر کے گھروں کو جا رہے تھے۔ خیر۔ اٹکتا رکتا وہ مس خان کی کرسی کے پاس آن کھڑا ہوا۔ اور دھیرے دھیرے منہ میں ڈالی ہوئی ربڑ کو چبانے لگا۔

مس خان نے بڑے تحمل سے اسے سوال سمجھانا شروع کیا۔

"دیکھو وسیم۔ اگر ایک آدمی دوسرے آدمی سے سو روپے ادھار لے" وہ ساتھ ساتھ کاپی پر لکھنے لگی۔ وسیم کاپی سے نظر ہٹا کر مس خان کے سر کے پچھلے حصے کو دیکھنے لگا۔ جہاں بڑی صفائی سے جوڑا بندھا ہوا تھا اور ننھے ننھے خمدار بال جوڑے میں سے آزاد ہو کر کھڑکی میں سے آتی ہوئی ہوا سے گردن پر لہرا رہے تھے۔ وہ بڑے انہماک سے یہ نظارہ دیکھتا رہا۔ اسے مس خان کی گردن کا یہ حصہ بہت پسند آیا۔

"سمجھ میں آ رہا ہے نا۔" مس خان سے نظریں اٹھا کر پاس کھڑے وسیم کو دیکھا اور وسیم کو ان کی آنکھیں بہت اچھی لگیں۔ کیسی بھوری بھوری سی تھیں۔ اور ان کے کپڑوں سے خوشبو کتنی اچھی آ رہی تھی وسیم کا چہرہ شرم سے گلابی ہو گیا۔

"جی ہاں۔جی ہاں" وہ ہکلایا " آ گیا سمجھ۔ آپ نے بہت اچھی طرح سمجھایا ہے۔ ہے تو غلط بات۔ کیوں ہم کسی کو سو روپے دیں مگر اب میں سمجھ گیا ہوں۔ پتہ نہیں پہلے کیوں نہیں سمجھ میں آتا تھا۔"

"اگر تم چھپکلیوں وغیرہ سے کھیلنے کی بجائے سوال کی طرف دھیان دیتے تو تمہیں پہلے ہی سمجھ میں آ جاتا" مس خان نے کاپی بند کرتے ہوئے قدرے غصہ سے کہا۔ اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔

وسیم گھر آ گیا مگر اب وہ مس خاں کا بے دام غلام تھا۔ اسے یاد آیا کئی لڑکے مس خاں کی میز پر روزانہ ننھے منھے گلدستے رکھ دیتے تھے۔ کیوں نہ وہ بھی پھول رکھ کر ان کا التفات جیتے۔

دوسرے دن اس نے گھر کی کیاریوں سے توڑ توڑ کر پھولوں کا ایک گٹھا جمع کیا۔ اور لے کر سکول چل دیا۔

مس خان کلاس روم میں داخل ہوئیں تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ ان کی میز پر نوچے کھسوٹے پھولوں پتوں اور ٹیڑھی شاخوں کا ایک انبار پڑا ہے۔

"اوہ خدا ------- یہ کون لایا ہے" وہ ششدر سی ہو کر بولیں۔ اور وسیم خوشی سے پھول کر کپا ہو گیا۔ مارے مسرت کے منہ سے بات نہ نکلتی تھی' وہ سارا دن اس نے سامنے والی سیٹ پر بیٹھ کر مس خان کو تاکنے اور طرح طرح کے خواب دیکھنے میں گزار دیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا کہ کوئی کیا پڑھا رہا ہے۔

"وسیم میں ابھی کیا کہہ رہی تھی؟" وسیم کو غائب دماغ پا کر مس خان نے پوچھا۔

وسیم کھانسا اور اس امید پر مس خان کر دیکھا کہ شاید وہ خود ہی کچھ بتا دیں مگر وہ خاموش رہیں تو اسے بولنا پڑا۔

"کچھ لوگوں کو روپے دینے کے متعلق .....؟" اس نے پر امید انداز سے پوچھا۔

"وسیم" انہوں نے ڈپٹ کر کہا "یہ حساب کا پیریڈ نہیں ہسٹری کا ہے اور ابھی میں تمہیں پانی پت کی پہلی لڑائی کے متعلق بتا رہی تھی -------"

"اوہ اچھا۔ اچھا -------" وسیم نے چمک کر کہا۔

"مجھے اس کے متعلق کچھ بتاؤ --------"

"ابھی تو مجھے کچھ پتہ نہیں۔ جب آپ بتائیں گی تو ....." وہ معصومیت سے بولا۔

"میں ابھی اسی کے متعلق تمہیں بتا رہی تھی" مس خان نے اس کی طرف سے مایوس ہو کر کہا۔ "کاش تم غور سے سنا کرو ------"

وسیم سہ پہر کو گھر پہنچا تو سارے لان میں لوگ پھر رہے تھے اور ایک ہلچل مچی ہوئی تھی پتہ چلا کہ باغ کے سارے پھول کوئی چرا کر لے گیا ہے اس کے بارے میں تفتیش ہو رہی ہے۔

"تم نے تو کسی کو پھول توڑتے نہیں دیکھا وسیم؟" مینا نے پاس آ کر پوچھا۔

"نہیں آپا ------- مجھے کچھ پتہ نہیں" وہ نظریں چرا کر بولا "میں تو ابھی سکول سے آیا ہوں" ------ اور چپکے سے اندر کھسک گیا۔

شام کو وہ بڑی مستعدی سے ساری کتابیں سمیٹ کر مطالعے کی میز پر بیٹھ گیا۔ اس نے تہیہ

کر لیا تھا کہ سارا سبق یاد کر کے مس خان کو خوش کر دے گا۔ پاس ہی ابا آرام کرسی پر بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے وہ کتابیں کھول کر سنجیدگی سے پڑھائی میں جٹ گیا۔

"ابا جان" اچانک اس نے پوچھا۔ "اگر میں آپ سے کہوں کہ آپ مجھے سو روپے دے دیں۔ اور یہ وعدہ کروں کہ ہر سال آپ کو پانچ روپے دیا کروں گا تو کیا آپ مجھے سو روپے ادھار دے دیں گے ؟"

"نہیں بیٹے۔ بالکل نہیں" ابا جان نے جواب دیا۔

"میرا بھی یہی خیال تھا۔ یہ سوال ہے ہی غلط ------- " اس نے منہ بنا کر کہا۔

کلیم صاحب اب ایڈیٹوریل پڑھنے لگے تھے کہ وسیم نے پھر سوال داغ دیا۔ "ابا جان۔ پانی پت کی پہلی لڑائی کب ہوئی تھی -------"

"بھئی مجھے کیا پتہ ------ میں کوئی وہاں موجود تھا" انہوں نے ناراض ہو کر کہا۔

"میں اس کے متعلق لکھنے لگا تھا کہ اس کے اسباب کیا تھے۔ مگر آپ ....."

وسیم ان کے عدم تعاون پر رنجیدہ ہو کر بولا۔

کلیم صاحب تنگ آ کر اٹھے۔ اپنے اخبار کو سمیٹا اور وہاں سے اٹھ کر برآمدے میں جا بیٹھے۔

ابھی انہوں نے لیڈنگ آرٹیکل ختم کیا ہی تھا کہ وسیم صاحب اپنی کتابوں اور کاپیوں سے لدے پھندے وارد ہوئے اور پاس والے دیوان پر آ کر بیٹھ گئے۔

"ابا جان اس کی فارسی کیا ہو گی' میری امی باغ میں پھر رہی ہیں؟"

"مجھے نہیں پتہ" انہوں نے جھلا کر کہا "اور یہ تم کیا کر رہے ہو"

"ہوم ورک" کلیم صاحب پھنکارے "پہلے تو تم کبھی ہوم ورک نہیں کرتے تھے"-------

"جی ہاں۔ مگر اب کیا کروں گا" وسیم نے مستعدی سے کہا "اس لئے کہ مس خان نے ..... اس لئے کہ مس خان نے" .....وہ بالکل سرخ ہو رہا تھا۔

"اس لئے کہ مس خان ....." وہ خاموش ہو گیا۔ کلیم صاحب نے ایک ملامت کی نگاہ اس پر ڈالتے ہوئے خاموشی سے اپنا اخبار اٹھایا اور جا کر سن روم میں بیٹھ گئے۔ جہاں ان کی بیوی بیٹھی نٹنگ کر رہی تھی۔

وسیم قطعی پاگل ہو گیا ہے" انہوں نے بشاشت سے اطلاع دی۔

"پڑھائی کا دورہ پڑا ہے۔ اور کسی مس خانم کہ پتہ نہیں مس خان کا بار بار تذکرہ کر رہا ہے۔ میں اسے اکیلا چھوڑ کر آ گیا ہوں ------"

مسز کلیم دھیرے سے مسکرائیں اور اپنے کام میں لگی رہیں کلیم صاحب نے ابھی دوسرا صفحہ اٹھایا ہی تھا کہ وسیم نے پھر جھانکا۔ اس کا چہرہ قطعی سنجیدہ تھا۔

"ابا جان ہالینڈ کا دارالخلافہ کون سا ہے ؟--------"

"تم سمجھتے ہو میں کوئی انسائیکلوپیڈیا ہوں" وہ دہاڑے ۔ پھر مڑ کے بولے "بیگم اسے کوئی ڈکشنری وغیرہ خرید دو۔ تاکہ میرا سر نہ کھایا کرے۔"

"میں اسے علیحدہ کمرہ پڑھائی کے لیے دے دوں گی۔" وہ تحمل سے بولیں--------

"اب تو خدا خدا کر کے اس نے تعلیم میں دلچسپی لینی شروع کی ہے۔"

"ایک کمرہ ----؟ ہونہہ۔ اسے تو پورا گھر چاہیے"

کلیم صاحب نے طنزاً کہا "ایک کمرے میں کیا بنتا ہے۔"

دوسرے روز مس خان وسیم میاں کی توجہ اور تعلیم میں خصوصی دھیان کو دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ وہ اچانک ہی پڑھائی میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ چھٹی کے وقت وہ ان کے ساتھ رجسٹر وغیرہ سنبھالے گیٹ تک چھوڑنے گیا۔ مس خان نے بہتیرا اس سے جان چھڑانی چاہی مگر اس کے جوش و خروش کے سامنے ایک نہ چلی۔ راستہ بھر وہ اپنا تھن متھنا گلابی چہرہ' جو مارے اشتیاق و مسرت کے دمک رہا تھا۔ اوپر اٹھائے' مستقل باتیں کرتا گیا۔

"مس خان آپ کو پتہ ہے۔ مجھے ڈاکو بہت اچھے لگتے ہیں۔ آپ کو بھی اچھے لگتے ہیں؟"

"نہیں بھئی" مس خان نے قدرے درشتی سے کہا "مجھے یہ کمبخت بالکل اچھے نہیں لگتے"

وسیم کا دل بیٹھ گیا۔ یہ لوگ تو بہت اچھے ہوتے ہیں۔ لٹیرے اور ڈاکو۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"نہیں۔ بالکل اچھے نہیں ہوتے" مس خان نے سنجیدگی سے کہا۔

"اچھا چلئے انہیں چھوڑیں" وہ جلدی سے بولا "یہ بتائیے آپ کسی دن ہمارے ساتھ شکار کو جانا پسند کریں گی؟"

"کس کے ساتھ؟" مس خان چونکیں۔ تو وسیم کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ تو یونہی رواداری میں کہہ گیا تھا۔

"اوہ کچھ نہیں۔ کچھ نہیں" اور پھر بقیہ رستہ وہ کچھ دیر نہیں بولا۔ ویسے اب وسیم کی زندگی میں کچھ انقلاب ضرور آ گیا تھا۔ وہ باقاعدگی سے سبق یاد کرتا۔ اگلی سیٹ پر عین مس خاں کے سامنے بیٹھتا اور مستقلاً انہیں تکتا رہتا۔ گھر کا کام کرلانے میں اسے وقت تو محسوس ہوتی تھی۔ تاہم وہ بڑی بے جگری سے یہ کٹھن ذمہ داری نبھاتا رہا۔ محض مس خان کی خاطر وہ اتنی تکلیفیں

برداشت کر رہا تھا۔

ایک دن مس خان کے منہ سے نکل گیا" مجھے گل چہرہ بہت پسند ہیں ------ بے انتہا پسند"

بس وسیم نے یہ بات پلے باندھ لی۔وہ ان کے لئے ڈھیروں گل چہرہ لائے گا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ وسیم کے باغیچے میں پھول نہیں تھے۔ اسے پہلی دفعہ اپنے باغیچے کی ناداری اور نکمے پن کا احساس ہوا اس نے جاکر مالی سے استدعا کی کہ اسے کہیں سے گل چہرہ کا گلدستہ لا دے۔

"نہیں وسیم میاں۔ میں جن گھروں میں کام کرتا ہوں وہاں گل چہرہ نہیں اگتے۔ اور دیکھو میرا ہوز پائپ چھوڑ دو اس کی بوچھاڑ مجھ پر پڑ رہی ہے۔ نہیں میاں۔ گل چہرہ کہیں نہیں ملیں گے۔ ذرا گھاس کے تنختے سے ورے ہو کر چلو ------"

"ہونہہ" وسیم نے غصے سے کہا۔ اور واپس چلا آیا۔ کس قدر کا نکما مالی تھا یہ بھی۔خیر۔ وہ خود ہی یہ مسئلہ حل کرے گا۔ وہ کوٹھی کے گرد گھوم کر پچھواڑے کی طرف چل دیا۔ کچھ سوچ کر باڑ پھاندی اور ساتھ والے گھر کے باغیچے میں چلا گیا۔ لیکن یہاں ہر طرف گلاب ہی گلاب کھلے تھے۔ گل چہرہ کا کہیں پتہ نہ تھا۔ وہ مایوس ہو کر سڑک پر نکل آیا اور رستہ میں دونوں طرف کی کوٹھیوں کے باغیچوں پر نظر ڈالتا گیا۔ اچانک وہ رک گیا۔ ایک گھر کی کھڑکی میں اسے گل چہرہ کا گلدستہ نظر آیا۔ جو بڑی نفاست سے ایک خوب صورت نیلے رنگ کے گلدان میں سجا تھا اسے معلوم نہیں تھا۔ یہ کس کا گھر ہے۔ تاہم اس نے گلدستہ اڑانے کی ٹھان لی۔ دبے قدموں باغیچے میں سے ہوتا ہوا وہ کھڑکی تک پہنچا پھر اس کی کگر تھام کر آہستہ سے اندر کود گیا۔ بڑی احتیاط سے گلدان میں سے پھول نکالے اور واپسی کے لئے مڑا ہی تھا۔ کہ ایک نوکرانی اندر آگئی وسیم کو دیکھ کر اس نے ایک چیخ ماری اور اس کی طرف لپکی مگر وسیم کو ایسے مواقع سے نبٹنا آتا تھا۔ گلدستہ مضبوطی سے تھامے وہ کھڑکی میں سے کود کر سرپٹ بھاگا۔ دور تک اس کے کانوں سے نوکرانی کا شور ٹکراتا رہا۔ مگر اس نے پیچھے مڑ کر نہ دیکھا اور بھاگتا گیا۔ آخر اپنے پیارے گلدستہ کو سینے سے لگائے۔ ہانپتا کانپتا وہ گھر پہنچ ہی گیا۔ دیر تک باہر کے گیٹ سے لگا اپنی سانس درست کرتا رہا۔ پھر اندر چلا گیا۔ دوسرے روز وہ گلدستہ مس خان کی میز پر رکھ دیا گیا۔ رکھتے وقت وسیم کے غرور کی انتہا نہ تھی۔ کس مردانگی سے وہ گلدستہ اس نے حاصل کیا تھا۔

لیکن مس خان جب کلاس میں آئیں۔ تو انہوں نے گلدستے کو دیکھ کر ناک بھوں چڑھائی اور نفرت سے بولیں۔

"یہ گلدستہ کس نے یہاں رکھا ہے۔ اف۔ کیسے مسلے ہوئے پھول ہیں۔ ہٹاؤ انہیں یہاں

سے"

"مگر مس۔ مس آپ نے تو کہا تھا۔ مجھے گل چہرہ پسند ہیں۔" وسیم ہونٹوں کو زبان سے تر کرتا ہوا ہکلایا۔

"میں نے کچھ نہیں کہا تھا۔ فضول باتیں مت کیا کرو۔" مس خان نے غصے سے ڈپٹ کر کہا۔

وسیم کے غصے اور رنج و غم کی انتہا نہ رہی۔ دوسرے ہی پیریڈ میں اس نے ڈیسک بدل لیا اور پچھلی سیٹوں پر چلا گیا۔

اس شام اس مزے سے "ریڈانڈین" کھیل کھیلا اپنے چیدہ چیدہ دوستوں کے ساتھ مل کر خوب اودھم مچاتا رہا۔ اور ہوم ورک کے نزدیک تک نہ گیا۔ اسے پرانا دستور اپناتے ہوئے بے انداز خوشی محسوس ہو رہی تھی۔

"ارے" تم نے آج گھر کا کام نہیں کیا" ابا نے جو اسے یوں آوارہ پھرتے دیکھا تو حیران ہو کر بولے۔

"گھر کا کام -------" اس نے سر کھجلایا۔ "کر لوں گا مگر وہ جو مس خان ہیں نا ------ انہیں پتہ ہی نہیں کیا کہنا ہے۔ کبھی کچھ کہتی ہیں کبھی کچھ ----- بہت بری لگتی ہیں مجھے ------"

"مگر کام کا مس خان سے کیا تعلق ----" ابا نے قدرے متحیر ہو کر کہا۔ خیر تم جانو تمہارا کام ------ سزا ملے گی تو خود ہی ٹھیک ہو جاؤ گے -----"

"سزا" -------؟ انہیں جاتے دیکھ کر وسیم نے آہستہ سے کہا۔

"مجھے سزا کی کچھ پروا نہیں۔ مگر مس خان....."

6

بانگیوں اور لٹیروں کا گروہ سنجیدہ شکلیں بنائے گودام کی پچھلی طرف دیوار کے ساتھ لگا بیٹھا تھا۔ ان سب میں معمر ترین ممبر ہاشم جس کی عمر ساڑھے بارہ سال تھی اور جسے سب واجب الاحترام سمجھتے تھے۔ کافی غور کرنے کے بعد بولا۔

"بھئی آج کوئی ایسا کام کرنا چاہیے جو ہم نے پہلے کبھی نہ کیا ہو------"

اتوار کی اس صبح کو اب تک انہوں نے بہت سے کارنامے انجام دیے تھے ایک دوسرے سے کشتی لڑی۔ جڑی بوٹیاں پکا کر خالص ڈاکوؤں کے سے انداز میں ندیدوں کی طرح کھائیں۔ اونچی نیچی جگہوں پر مارچ کرتے پھرے۔

لٹیروں کا یہ گروہ جس کے مستقل ممبر چار عدد تھے۔ والدین کے علم میں نہیں تھا۔ دراصل انہوں نے خود ہی اپنے آپ کو پبلسٹی نہیں دی تھی۔ اس لئے والدین کے بے وقت چھاپے ان کی کئی شاندار سکیموں کو پہلے بھی ناکام بنا چکے تھے۔ لہٰذا اب کے انہوں نے بہتر یہ سمجھا کہ اپنی سرگرمیوں کو خفیہ رکھیں تاکہ دوسرے خواہ مخواہ دخل انداز نہ ہو سکیں۔

وسیم، جو ہمیشہ سے سکیمیں بنانے کے معاملے میں تیز تھا چمک کر بولا۔ "آؤ ہم رابن ہڈ کی طرح پرندے شکار کریں"

"مگر کون سے پرندے ------" فرخ نے پوچھا۔

"اور تیر کمان بھی تو ہیں ہمارے پاس" جواد نے کہا مگر وسیم مایوس ہونے والوں میں نہ تھا۔ بولا۔

"پرندے نہ سہی کچھ اور مار لیں گے" اس نے جوش سے کہا۔

"مثلاً بلیاں، کتے، مرغیاں وغیرہ ہیں ----- اور رہے تیر کمان تو وہ بازار سے بنے بنائے خرید لیتے ہیں -------"

"مگر یار ------- تیر کمان خود کیوں نہ بنا لیں" فرخ نے رائے دی۔

نہ بھئی وہ ٹھیک نہیں بنتے" وسیم نے بتایا " میں نے پہلے ایک دفعہ بنائی تھی۔ مگر اس کمان سے تیر سیدھا نہیں جاتا تھا۔ وہ جو حنیف کی دکان ہے نا مارکیٹ کے کونے پر اس کے پاس بڑے

اچھے تیر کمان ہیں ------"

"کیا قیمت ہے ان کی" جواد نے اشتیاق سے پوچھا۔

"بارہ آنے کی ایک۔ ساتھ دو تیر بھی ملتے ہیں۔ خوب مضبوط بنے" وسیم نے اطلاع دی۔

"بارہ آنے -----" بھئی ہمارے پاس بارہ بارہ آنے ہیں کہاں۔ فری کے پاس تو ایک بھی پیسہ نہیں۔ ساری پاکٹ منی کھا چکا ہے جواد کے پاس صرف پانچ آنے ہیں۔ اور تم وسیم....."

"مجھے تو اس دفعہ پاکٹ منی ملی نہیں" وہ اداس ہو کر بولا۔

"میں نے وہ بڑا گلدان توڑ دیا تھا۔ اس لیے....."

"پروا نہ کرو۔ ہم کسی طرح بارہ آنے کما لیں گے" جواد نے ڈھارس بندھائی۔

"وہ کس طرح" سب کے سب مڑے۔

"گھر سے کچھ چیزیں لے کر بیچ دیں گے۔"

"بیچ دیں گے" ہاشم نے نقل اتاری "مگر کون سی چیزیں۔ اور پھر لینے کون دے گا تم کو -----؟"

"اچھا۔ پھر کوئی مینا بازار وغیرہ لگا لیں" وسیم نے رائے دی "وہ جیسا آپا کے سکول میں لڑکیاں لگایا کرتی ہیں۔"

ایک لمحہ سکوت رہا پھر ہاشم نے خیال انگیز طریقے سے دہرایا۔

"مینا بازار۔ یعنی کوئی شو وغیرہ ------؟ -------- ہاں ------- یہ ٹھیک رہے گا --------"

"ہم اپنے گھروں میں سے کچھ چیزیں لے کر ان کی نمائش لگائیں گے" وسیم نے منصوبے کی مزید تفصیلات بتائیں "اور ان پر ٹکٹ لگا دیں گے۔"

"مگر ہو کیا چیز -------" جواد نے سوچتے ہوئے کہا۔

"یہی کتے بلیاں وغیرہ اور کیا" وسیم نے بتایا۔

"ایک بلی ہمارے گھر ہے کتا تم لے آنا۔ دو چار چوہے پکڑ لیں گے۔"

"بس ٹھیک ہے" ہاشم نے فیصلہ سنایا "جانوروں کی نمائش لگا کر پیسے کمائیں گے۔ پھر اس رقم سے تیر کمان خریدے جائیں گے اور نمائش اگلے اتوار ہو گی۔"

اس قرارداد کے پاس ہو جانے پر آج کا اجلاس ختم ہو گیا۔ وسیم آہستہ آہستہ کچھ سوچتا ہوا گھر لوٹا۔ پلنگ پر بیٹھ کر دونوں ہاتھ جـ ، ڈالے وہ سوچتا رہا۔ اس کے خیالات "نمائش" میں بھٹک رہے تھے۔ منصوبے کا سحر اس پر حاوی ہو چکا تھا۔

اچانک دوسرے کمرے سے ایک عجیب سی آواز آئی۔ جیسے انجن سٹیم چھوڑتا ہے۔ یہ آواز ایک تواتر کے ساتھ کبھی اونچی ہو جاتی کبھی نیچی ------ وسیم حیران تھا یہ کیا ہے۔ آخر اس نے جذبہ تجسس سے مغلوب ہو کر دوسرے کمرے میں جھانکا۔

وہاں ایک لمبے چوڑے پلنگ پر خالہ سلطان جہاں قلولہ فرما رہی تھیں۔ اور یہ خوف ناک آواز ان کے خراٹوں سے پیدا ہو رہی تھی۔ وہ حیرت زدہ سا کھڑا انہیں دیکھتا رہا۔ خالہ جان ایک ہفتہ ہوا پنڈی سے تشریف لائی تھیں۔ ان کے آنے پر ابا جان کا پارہ ہمیشہ چڑھ جایا کرتا تھا۔ وہ روزمرہ کی نسبت زیادہ چڑچڑے اور زود رنج ہو جاتے تھے اور نہایت بے قراری سے ان محترمہ کے واپس چلے جانے کے منتظر رہتے تھے مگر خالہ جان کا قیام ہمیشہ خاصا طویل ہوا کرتا تھا۔ یہ عرصہ رہائش جہاں امی کے لئے باعث مسرت ہوتا وہیں ابا کے لئے مسلسل کوفت کا باعث مگر وہ خاموش رہتے کچھ کہہ بھی نہیں سکتے تھے اس لئے کہ معاملہ بیوی کی چچازاد بہن کا تھا۔ اور خاصا نازک۔ گو وہ خود خوب موٹی تازی تھیں۔ بہرحال یہ تاریخی قیام اب شروع ہو چکا تھا۔ اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ محترمہ واپسی کے لئے کب بوریا بستر باندھیں گی۔ جس کے آثار فی الحال قطعی نظر نہ آتے تھے۔ مصیبت بالائے مصیبت یہ تھی کہ اپنی کسی فرضی بیماری کے باعث پیدا ہونے والی نقاہت کو دور کرنے کے لئے وہ خوب ڈٹ کر کھاتیں اور کھانے کے بعد غنودگی چھا جاتی۔ تو دوپہر تین چار گھنٹے سوتیں۔ ان کی زندگی میں بظاہر اب یہ دو کام ہی رہ گئے تھے۔ کھانا اور سونا ------

وسیم کچھ دیر وہیں کھڑا لطف اندوز ہوتا رہا۔ پھر کھانے کے کمرے میں چلا گیا جہاں ابا جان اور امی کی زوردار بحث ہو رہی تھی۔

"میں کہتا ہوں اس دفعہ ان کا قیام کتنے عرصہ کا ہو گا۔ ایک سال دو سال تین سال ------؟ آخر کتنی....."

وسیم کو دیکھ کر انہیں خاموش ہو جانا پڑا۔ اتنے میں خالہ جان بھی تشریف لے آئیں۔

"آپا جان ------ اچھی طرح سو لیں آپ؟" مسز کلیم نے نرمی سے پوچھا۔

"ہاں بھئی ------" وہ دھم سے کرسی پر بیٹھتی ہوئی بولیں۔

"مگر اب نیند رہ ہی کہاں گئی ہے مشکل سے آدھ گھنٹہ سوئی ہوں گی۔"

کلیم صاحب چپ چاپ اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔ اور سہ پہر کے ناشتے میں سے ایک بسکٹ لے کر آہستہ آہستہ کھانے لگے۔

"آپا جان۔ ابھی چائے کے بعد میں ذرا بازار جاؤں گی" مسز کلیم نے کہا "چلیں گی آپ

بھی؟"

"اے بی ------ میری صحت دیکھتی ہو ------" وہ ایک موٹا تازہ کیک کا ٹکڑا اٹھاتے ہوئے بولیں "نگوڑی اس قابل ہے کہ میں کہیں آ جا سکوں ---؟ اسی صحت کی خرابی کی وجہ سے تو کہیں آنا جانا مدتوں سے چھوٹ چکا ہے ------"

"افسوس ---" کلیم صاحب نے قدرے طنز سے کہا۔ مگر بیوی کے گھور کر دیکھنے سے خاموش ہو رہے۔

"ہائے پتہ نہیں یہ کم بخت صحت کب ٹھیک ہو گی۔" انہوں نے پلیٹ میں حلوہ لیتے ہوئے رقت سے کہا زندگی میں کوئی لطف ہی نہیں رہا۔ کوئی جگہ راس نہیں آتی بس ایک یہ تمہارا گھر ہے یہاں آ جاتی ہوں تو طبیعت کچھ ٹھیک ہو جاتی ہے۔ ورنہ نہیں ------"

اے وسیم بیٹے ذری انڈا ادھر بڑھانا ------"

کلیم صاحب نے انہیں خونخوار نظروں سے دیکھا۔ مگر وہ ادھر متوجہ ہی نہیں تھیں۔ ابھی کل کی بات ہے کہ میں لان میں ذرا زیادہ دیر پھرتی رہی۔ بس تھک گئی۔ اور ساری رات جسم درد کرتا رہا۔ اب چائے کے بعد تو بیٹھ کر صرف خط ہی لکھوں گی۔ وسیم میاں ذرا توس پر مکھن لگا دو۔ اے ہاں یہ بینا اور نعیم کہاں ہیں آج؟"

"صفدر صاحب کے ہاں گئے ہیں۔ ان کے بیٹے کی سالگرہ ہے۔"

مسٹر کلیم نے بتایا ---- اس پارٹی میں بلایا تو وسیم کو بھی گیا تھا مگر اس نے اپنی رابن ہڈ ٹائپ سرگرمیاں چھوڑ کر ایک بور قسم کی پارٹی میں جانا پسند نہ کیا جہاں مستقل تمیزدار بن کر رہنا پڑتا تھا۔ اور ہر دم بڑے بہن بھائی کی تنبیہی نظریں تعاقب کرتی تھیں حتیٰ کہ اگر کیک کا ایک فالتو ٹکڑا لے لو۔ تو ایسی آدم خور نگاہوں سے دیکھتے کہ لگتا ابھی کچا چبا جائیں گے نہ بھئی۔ ---- ایسی پارٹی سے وہ لنڈورا ہی بھلا۔ اسے ایک دو مرتبہ ایسے تلخ تجربے ہو چکے ہیں اور اب وہ کسی قیمت پر بھی انہیں دہرانا نہیں چاہتا تھا۔

کلیم صاحب میز سے اٹھ چکے تھے۔ مگر خالہ جان بیٹھی تھیں ساتھ ہی امی اور وسیم بھی ------ جو حیران ہو ہو کر حلوہ، انڈے بسکٹ وغیرہ غائب ہوتے دیکھتا رہا۔ یہ سارا کچھ خالہ جان کے معدے میں جا رہا تھا۔ بقیہ سہ پہر اس نے اپنے کمرے میں بیٹھ کر "نمائش" کے بارے میں مختلف منصوبے بنانے میں گزار دی۔

7

نمائش کا انعقاد اور جگہ وغیرہ کا تصفیہ بھی کچھ کم دردِ سر کا باعث نہ تھا۔ کسی کھلی جگہ منعقد کی ۔ ں تو افشائے راز کا ڈر تھا۔ آخر کافی بحث و تمحیص کے بعد طے پایا کہ وسیم کے کمرے میں نمائش لگائی جائے ۔ اور داخلہ باہر کے دروازے سے ہو۔ گیلری میں سے نہیں۔ اور اس مبارک کام کے لئے اتوار کی دوپہر کا وقت مقرر کیا گیا۔ جب کہ کھانے کے بعد ابا جان قیلولہ فرماتے تھے۔امی جان نے اپنی کسی عزیز سہیلی کے ہاں چلے جانا تھا۔ اسی طرح گھر کے باقی افراد بھی اتوار منانے کہیں جا رہے تھے۔ چنانچہ ان سب کی غیر موجودگی میں باسانی یہ کھیل رچایا جا سکتا تھا۔ علاوہ ازیں اتوار کو چھٹی ہونے کی وجہ سے "ناظرین" بھی مہیا ہو سکتے تھے۔

اتوار کا دن بے حد خوشگوار تھا۔ روشن اور پیارا ------ وسیم اور اس کے دوست علی الصبح ہی اپنے کام میں جٹ گئے وسیم نے امی سے پہلے ہی نہایت عجز کے ساتھ اجازت لے لی تھی کہ میرے کچھ دوست آ کر میرے کمرے میں کھیل لیں؟ ظاہر ہے امی کو کوئی اعتراض نہ تھا۔ اس لئے کہ کم سے کم اتنا عرصہ کلیم صاحب اس کے شور و شر سے محفوظ رہ سکتے تھے۔

قریباً دو بجے وہ تمام اشیاء تیار تھیں جن کی نمائش لگانا تھی۔ کھڑکی کے پاس ایک پنجرہ لگایا گیا اس میں ایک سفید رنگ کا چوہا تھا جس پر بڑی محنت سے واٹر کلر کی مدد سے نیلی اور سرخ دھاریاں بنائی گئی تھیں یہ فرخ میاں کی پیش کش تھی۔ چوہا بے چارہ حیرت زدہ شکل بنائے مستقل اپنی دھاریاں چاٹے جا رہا تھا۔ اس کے پنجرے پر ایک بورڈ لٹک رہا تھا--- جس پر لکھا تھا"چینی چوہا۔ چین کے سارے چوہے ایسے ہی ہوتے ہیں ----"

اس کے بعد ایک بلی کا نمبر تھا۔ یہ بلی وسیم کی آپا بینا کی تھی چہیا نام نہایت کنگھنی اس کی نوچ کھسوٹ کی بری عادتوں کے باعث اسے ٹوکرے کے نیچے بند کر دیا گیا تھا۔ وسیم کے ساتھ اس کی سدا کی دشمنی تھی ۔ اب جو مرضی کے خلاف اسے ٹوکرے تلے بند کیا گیا تو بلی چہیا کے غصے کی انتہا نہ تھی۔ وہ مسلسل ٹوکرے کے نیچے گھوم رہی تھی۔ دم کھڑی کیے اس پر پنجے مار رہی تھی۔ تاکہ کسی طرف نکل سکے۔ ٹوکرے کے اوپر گتے کا ایک بورڈ نصب تھا۔ جس پر لکھا تھا "وحشی بلی" ------ ذرا آگے چل کر ایک جن کا دیدار ہوتا تھا۔ جسے فرخ کی پیٹھ پر جواد کو سوار کر کے اوپر چادر ڈال کر نہایت چابکدستی سے بنایا گیا تھا۔ اس کے عین پیٹ پر ایک بورڈ

لٹک رہا تھا۔ اوپر تحریر تھا۔ "سچ مچ کا جن"۔

ادھر فرخ بے چارے کی بری حالت تھی۔ چنانچہ جن کے پیٹ کے نواح میں سے عجیب و غریب غصیلی آوازیں برآمد ہو رہی تھیں کہ بوجھ سے میرے کندھے ٹوٹ رہے ہیں مجھے پتہ ہوتا تو کبھی جن نہ بنتا کچھ اور بن جاتا۔ اب ہاف ٹائم ہونا چاہیے جس کے بعد میں اوپر چڑھوں گا اور جواد نیچے آئے گا۔ وغیرہ۔

اس سے آگے وسیم کی پیش کش ایک کالے رنگ کے ہرن کی کھال تھی جو اکثر ابا نماز کے لئے استعمال کرتے تھے۔ مگر اس وقت اپنے پورے جاہ و جلال کے ساتھ کیلوں کی مدد سے دیوار پر ٹانگ دی گئی تھی نیچے ایک گتے کا بورڈ تھا۔ لکھا تھا"ایک ریچھ کی کھال جسے ہم نے سندر بن میں مارا" پھر ایک کتے کا نمبر آتا تھا------ یہ فرخ میاں کا فاکس ٹیریر تھا موتی۔ ------ اس غریب کی شامت آئی ہوئی تھی۔ صبح صبح جواد اور فرخ نے مل کر بڑی محنت سے کھڑکیوں پر کرنے والا نیلے رنگ کا پینٹ اس پر کیا تھا۔

موتی پہلے تو احتجاج کرتا رہا۔ پھر بے چارہ مردہ بدست زندہ کے مصداق خاموش ہو ۔ اب اپنی نیلی' جگہ جگہ سے چمٹی ہوئی کھال کے ساتھ بیٹھا وہ ہر آنے جانے والے کو نہایت رحم طلب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

خود وسیم صاحب جو شومین کا پارٹ کر رہے تھے دیکھنے کی چیز تھے انہوں نے ابا جان کا ڈریسنگ گاؤن پہن رکھا تھا۔ جس کی ڈوریاں چلنے میں بار بار پیروں تلے آ کر الجھ رہی تھیں۔ روئی کو بٹ کر گوند کی مدد سے چپکا لیا گیا تھا جس سے نہایت شان دار مونچھیں بن گئیں تھیں سر پر گتے کا تاج تھا جس پر پنیاں اور رنگ برنگے موتی لگے ہوئے تھے۔ یہ حسین و جمیل تاج کسی زمانے میں بینا نے اپنے سکول میں ہونے والے ڈرامے میں پہنا تھا۔ جب وہ پرائمری کلاسوں میں تھی ------ اس وقت سے وسیم صاحب نے اسے اپنے بکس میں یادگار کے طور پر محفوظ کر رکھا تھا۔ انہوں نے بڑے کروفر سے نمائش کا ایک چکر لگایا کئی غلطیوں کی اصلاح کی جن بہت بد تمیز ثابت ہو رہا تھا۔ اسے ڈانٹا۔

"فرخ۔ آرام سے کھڑے رہو اور باتیں مت کرو لوگ کیا کہیں گے جن پیٹ سے بول رہا ہے ۔ خاموش ۔ معلوم ہوتا ہے لڑکے آ رہے ہیں" اور وہ استقبال کے لئے دروازے کے غریب آ گیا۔

باہر دروازے پر ہاشم ٹکنیں دینے کھڑے تھے۔ لڑکوں کی ایک قطار دبے قدموں چلتی' چوروں کی طرح ادھر ادھر دیکھتی آہستہ آہستہ رینگتی آ رہی تھی۔ ہاشم نے نہایت خاموشی سے فی

لڑکا ایک آنہ کے حساب سے پیسے لیے اور ٹکٹ دیتا گیا۔ اندر وسیم اپنی ڈیوٹی کے لئے تیار کھڑا تھا۔ لڑکوں کے اندر آتے ہی اس نے کسی پیشہ ور مداری کی طرح کہنا شروع کیا۔

"دیکھئے صاحبان! یہ چینی چوہا ہے۔ اس پر نیلی دھاریاں ہیں۔ چین میں سارے چوہے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ سارے پاکستان میں یہ ایک ہی چینی چوہا آپ کو ملے گا۔ اور کہیں نہیں چڑیا گھر میں بھی نہیں یہ خاص طور پر ہم نے ایک ہوائی جہاز پر چین سے منگایا ہے اس کے ساتھ ہی ہم نے خاص قسم کی ڈبل روٹی بھی منگائی ہے تھی جناب یہ وہی ڈبل روٹی کھاتا ہے اور کچھ نہیں۔

وہ دم لینے کے لیے رکا تو ایک طرف سے آواز آئی۔

"ذرا اسے دھو دیں؟" وسیم نے حقارت سے کہا" ہونہہ۔ ارے ہم تو اسے روزانہ صابن سے نہلاتے ہیں۔ صابن سے چینی چوہوں کو اگر روزانہ نہ نہلایا جائے تو جناب یہ مرجاتے ہیں"۔

اب بلی کی طرف متوجہ ہوا۔

"اور یہ بلی وحشی بلی ہے۔ اسے ہم نکالیں گے نہیں ورنہ تمہیں کاٹ کھائے گی۔ ہاں جناب اس قدر کی لڑاکا بلی ہے یہ ------ کبھی ایسی بلی تم نے نہ دیکھی ہوگی۔ یہ شیر سے بھی لڑ سکتی ہے"

"ارے یہ تو چمپا ہے۔ بینا آپا کی بلی -------" ایک لڑکے نے جو ٹوکرے کی درزوں میں سے دیکھ رہا تھا کہا۔

وسیم اس پر بڑے سرپرستانہ انداز سے ہنسا۔ اور کوئی جواب نہ دیا۔ جواب جاہلاں باشد خاموشی۔

اب جن کی باری تھی۔

"یہ جن ہے" وسیم نے تاج ٹھیک کرتے ہوئے کہا جو ذرا ڈھیلا ہونے کے باعث پیشانی پر جھک آیا تھا۔ "سچ مچ کا اصلی جن بڑی مشکل سے ہم نے اسے پکڑا۔ دیکھو کتنا بڑا ہے یہ۔ کبھی اتنا اونچا آدمی تم نے دیکھا؟ نہیں دیکھا نا ------ اب یہ تمہیں چل کر دکھائے گا۔" اس حکم پر بے چارے جن نے چلنا شروع کیا۔

"ذرا تیز چلو" ------ وسیم نے مزید حکم دیا۔ تو فرخ کا پیمانہ صبر سے لبریز ہو گیا۔

"اگر ایسے کہو گے تو میں جواد کو گرا دوں گا۔ ہاں میں پہلے تھکا ہوا ہوں" اس پر دو چار بدتمیز ہنس پڑے تو وسیم کو جلدی سے کہنا پڑا۔

"اچھا بس کرو جن۔ شاباش"

"اس جن کی شکل جواد جیسی کیوں تھی۔ ------؟" ایک چھوٹے سے لڑکے نے جرح کی۔

بھئی کسی کی شکل تو ہونا ہی تھی ------" وسیم نے جھلا کر کہا۔

"آخر بغیر شکل کے تو جن نہیں ہوتے نا -------"

اب وہ ریچھ کی کھال کی طرف مڑے جسے باغیوں نے سندر بن میں ہلاک کیا تھا مگر اسے فوراً پہچان لیا گیا۔ لہٰذا وسیم کتے کی طرف بڑھ گیا۔

"جناب یہ نیلا کتا ہے" وہ فاتحانہ انداز میں بولا۔ "نیلا کتا۔ تم نے پہلے کبھی نیلا کتا دیکھا ہے؟ لو اسے غور سے دیکھ لو۔ یہ خاص طور پر ہماری نمائش کے لیے نیلا بنایا گیا ہے۔ ساری دنیا میں یہ ایک ہی نیلا کتا ہے۔ بس اور کوئی نہیں ---- اگر یہ چڑیا گھر میں ہوتا تو اس پر ایک روپے کا ٹکٹ لگتا۔ مگر ہم تمہیں صرف ایک آنے میں دکھا رہے ہیں۔ میرا خیال ہے چڑیا گھر والے اسے ضرور مانگیں گے اور تم دیکھنا ہزاروں روپے دیں گے اس کے لیے جناب میں بھورے کالے اور سفید کتے تو بہتیرے ہیں مگر نیلا کتا کہیں نہیں ملتا ----"

وسیم نے واقعی چرب زبانی کا حق ادا کر دیا تھا لڑکے دم بخود کھڑے اس نیلے کتے کو دیکھ رہے تھے۔ جو دردناک نظروں سے دم ٹانگوں میں دبائے سب حاضرین کو تک رہا تھا۔

آخر ایک لڑکے نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"یہ تو صرف پینٹ ہے۔ ہاشم کے گیٹ پر ایسا ہی پینٹ کیا گیا ہے" مگر اس کی بات کو درخور اعتنا نہ سمجھا گیا اور لڑکوں پر نیلے کتے کا سحر چھایا رہا۔

اچانک دوسرے کمرے سے انجن کے سٹیم جیسی آواز بلند ہونی شروع ہوئی۔ سب کے کان کھڑے ہوگئے یہ حیرت انگیز آواز کبھی ڈوبتی کبھی ابھرتی ---- ان کو اپنے طلسم میں جکڑ رہی تھی۔

"یہ کیا ہے؟" ایک لڑکے نے قدرے سہم کر پوچھا۔

"ہاں بھلا بتاؤ یہ کیا ہے" وسیم نے پر اسرار انداز سے کہا۔ اور دل ہی دل میں ان کی حیرت پر خوش ہونے لگا۔

"اوہ یہ تو کوئی خراٹے لے رہا ہے" آخر ایک لڑکے کے دور رس دماغ نے سارا راز بھانپ لیا۔

"خراٹے ------" وسیم نے منہ بنایا "ہاں ہیں تو خراٹے ہی --- مگر عام قسم کے خراٹے نہیں جو تم روزانہ اپنے ابا کے سنتے ہو۔ جناب یہ خاص قسم کے خراٹے ہیں۔ بھلا تم ایسے

خراٹے لے کر دکھا سکو گے نہیں نا۔۔۔۔؟" وہ فاتحانہ انداز میں ہنسا۔ اس کا تیز و طرار ذہن ایک نہایت دلنشیں سکیم کو ترتیب دے چکا تھا۔۔۔۔! لڑکے کان دھر کر غور سے ان سپیشل خراٹوں کو سننے لگے۔ ہر اونچے پاٹ دار سر پر ان کے چہروں پر مسکراہٹ دوڑ جاتی اور وہ کھسر پھسر کرنے لگتے۔ اجازت نہیں تھی ورنہ وہ قہقہے لگا کر ہنستے۔ تماشائیوں کی ایک نئی کھیپ بھی پہنچ گئی تھی اور ان سب کے چہروں سے وسیم کو اندازہ ہو گیا تھا کہ خراٹے کس قدر توجہ کو کھینچنے والے ثابت ہو رہے تھے۔

اس نے جلدی سے جا کر ہاشم کو اپنی سکیم بتائی جس میں خراٹوں کو مزید جلب زر کا ذریعہ بنانے کا ذکر تھا۔ ہاشم خوش ہو کر بولا۔ "بالکل ٹھیک میں انہیں یہیں روکتا ہوں۔ تم جاؤ اپنا کام کرو۔"

وسیم نے باہر جا کر جوتے اتارے اور آہستہ سے دروازہ کھول کر خالہ جان کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہ مزے سے اپنے عظیم الشان بدن کو پلنگ پر پھیلائے سو رہی تھیں اور خراٹے سارے میں گونج رہے تھے۔ وہ کچھ دیر کھڑا تعجب کرتا رہا۔ کہ آخر وہ خود ان خراٹوں کی قلعہ شکن گرج سے کیوں نہیں جاگ اٹھتیں پھر اسے فرض نے آواز دی اور وہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا ذرا سی دیر میں اس نے "سب ٹھیک" کی رپورٹ ہاشم کو دی۔ تو اس کے اشارے پر تمام زائرین جوتے اتارے آہستہ آہستہ کمرے میں داخل ہوئے جو خراٹوں کا منبع تھا۔

یہاں دروازے کے قریب ہی ایک گتے کا ٹکڑا لٹک رہا تھا جس پر وارننگ درج تھی "خاموش رہو!"

ذرا آگے چل کر خالہ جان کا پلنگ تھا۔ اس کے سرہانے بڑی چابکدستی سے ایک بورڈ لٹکایا گیا تھا جس پر لکھا تھا۔

"موٹی جنگلی عورت"

اس نظارے کو دیکھ کر لڑکوں کو جو مسرت ہوئی وہ ناقابل بیان تھی۔ وہ نہایت انہماک سے چہروں پر شرارت اور بشاشت کی چمک لیے' کھڑے ان واجب الاحترام خاتون کو دیکھ رہے۔ جن کے عظیم الشان ابھرتے دبتے جثے سے یہ انتہائی دلچسپ آوازیں برآمد ہو رہی تھیں زائرین کے اشتیاق کا یہ عالم تھا کہ جب انہیں کھینچ کھانچ کر دورے کمرے میں لیجایا گیا تو وہ مزید پیسے دے کر پھر آن کھڑے ہوئے۔

اب حالت یہ تھی کہ خالہ جان کا کمرہ مشتاقان دید سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور اصل نمائش کی طرف کوئی دھیان نہ دیتا تھا۔ سب کے سب دگنے تگنے پیسے دے کر یہ دلچسپ نظارہ دیکھنے

آ رہے تھے مگر ان کی خاموشی بھی قابل داد تھی۔ وہ نہایت سختی سے بورڈ کی تنبیہ پر عمل کر رہے تھے۔

ادھر وسیم نے عوامی دلچسپی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چند اور بورڈوں کا اضافہ کر دیا تھا چنانچہ سنگھار میز پر اب دو تین اور بورڈ نظر آ رہے تھے۔ جن پر لکھا تھا "موٹی جنگلی عورت کی کنگھی۔"

"موٹی جنگلی عورت کے دانت" ——— "موٹی جنگلی عورت کا برش" اور خالہ جان تھیں کہ نہایت آرام سے نیند کے مزے لوٹ رہی تھیں اس بات سے بے خبر کہ ان کا حقیر وجود کس قدر دلچسپی اور شادمانی کا موجب بن رہا ہے۔

دوسرے کمرے میں نمائش کی حالت ابتر ہو چکی تھی۔ چینی چوہے نے چاٹ چاٹ کر اپنی ساری دھاریاں غائب کر دی تھیں اور نیچے سے اصلی سفید چوہا نکل آیا تھا۔ ریچھ کی کھال نیچے گر پڑی تھی۔ جن کے دونوں حصے یعنی فرخ اور جواد الگ الگ کرسیوں پر بیٹھے مزے سے ٹافیاں کھا رہے تھے۔ لیکن کسی کو اس کی پروا نہیں تھی۔ تماشائیوں کے ہجوم نے دو دو تین تین دفعہ ٹکٹ خرید کر ہاشم کو مجبور کر دیا تھا۔ اب وہ سفید کاغذ کے عمدہ ٹکٹوں کی جگہ ردی اخبار کی پرچیاں بنا بنا کر بیچنے لگے۔ دولت تھی کہ ہن کی طرح برس رہی تھی۔ وسیم میاں اور ان کے ساتھیوں کے وارے نیارے ہو گئے تھے مگر قسمت کی بات اچانک ایک زائر کو چھینک آ گئی۔ اور خالہ جان جاگ پڑیں۔

انہوں نے ایک مرتبہ تو ہکا بکا ہو کر اپنے گرد کھڑے مشتاق ہجوم کو دیکھا۔ جو اپنی ننھی ننھی آنکھوں کھلے ہوئے ہونٹوں سے کھڑا نہایت انہماک سے انہیں گھور رہا تھا۔ پھر وہ اٹھ بیٹھیں اور ان کی نگاہیں ادھر ادھر نہایت نفاست سے ٹنگے ہوئے بورڈوں پر پڑیں۔ پھر وسیم پر آن رکیں۔ جو آنکھیں پھاڑے اس بات کا منتظر تھا کہ دیکھیں کہ اب پردہ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔

خالہ جان کے قدرے کم ذہن دماغ میں آخر ساری صورت حال آ ہی گئی۔ اور وہ وسیم کی طرف جھپٹیں ایک آدھ تھپڑ اسے لگایا اور چنگھاڑنے لگیں "بے ہودہ بے تمیز ناہنجار بچے دیکھو تو کیسے تجھے ٹھیک کرتی ہوں "ادھر مشتاقان دید سب سرپٹ بھاگ گئے ——— خالہ جان وسیم کو کھینچتی ہوئیں مسز کلیم کے پاس لے گئیں اور ساری روئیداد کہہ سنائی۔ کلیم صاحب بھی آنکھیں ملتے آ گئے تھے۔ خالہ جان نہایت جوش و خروش سے اپنی ذہانت کی کہانی سنا رہی تھیں۔

"اور وہ بدمعاش بچے یوں کھڑے مجھے گھور رہے تھے گویا میں کوئی چڑیا گھر کا جانور ہوں۔ اور یہ سب اس نالائق پاجی وسیم کی شرارت ہے"

وہ وسیم کی طرف یوں مڑیں گویا اسے کچا چبا جائیں گی۔ مسز کلیم اپنی جگہ شرمندہ سی چور بنی

کھڑی تھیں۔ انہوں نے کئی دفعہ ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں معذرت کی کوشش بھی کی۔ مگر خالہ جان کی زبان کے آگے بند باندھنا بھی جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔

"دیکھئے آپا جان! بچہ ہی تو ہے۔ اسے معاف کر دیجئے"

"آخر انہوں نے بدقت باتوں کے اس طوفان کے دوران کہا۔"میں اسے ابھی ٹھیک بناتی ہوں"

"نہیں بی۔ میں اب یہاں ایک منٹ نہیں ٹکوں گی۔ میرا سامان بندھوادو" خالہ جان کے غیض و غضب میں کمی کے کوئی آثار نہ تھے۔

"غضب خدا کا۔ اس بائشت بھر لونڈے نے ہمارا یہ ہڈا بنایا۔ اور کوئی سزا نہیں۔ کچھ نہیں۔ کلیم میاں بھی منہ میں گھنگھنیاں ڈالے کھڑے ہیں۔ گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔" اور وہ غصے پھنکارتیں اپنے کمرے میں سامان سمیٹنے چلی گئیں۔ مسز کلیم کی منت سماجت کا بھی کوئی اثر نہ ہوا۔

"دیکھو بی۔ میں تو کم سے کم تین چار ماہ کے ارادے سے ہی آئی تھی مگر میری توبہ۔ جو اب کبھی یہاں قدم رکھ جاؤں۔ یہ گھر اب رہنے کے قابل نہیں ـــــــ" انہوں نے ان کے اصرار پر چنگھاڑ کر کہا مسز کلیم کی ہمت نہ پڑی کہ پھر کچھ اور کہہ سکتی۔

اور شام کے قریب خالہ جان کو ٹیکسی پر سوار کر کے جب مسز کلیم اداس اور شرمندہ سی گیٹ سے واپس ہو رہی تھیں تو پیچھے آتے ہوئے کلیم صاحب نے مجرموں کی طرح سر جھکائے ساتھ چلتے ہوئے وسیم کو سختی سے ڈانٹ پلائی۔ وسیم۔ آئندہ ایسی بدتمیزی نہ کرنا سخت بے ہودگی کی بات ہے بھلا خالہ جان پر بھی کوئی ٹکٹ لگاتا ہے"

وسیم سہم گیا کہ ابھی کان کھینچے جائیں گے مگر ابا کا ہاتھ جیب سے نکلا تو کان پکڑنے کے لئے نہیں۔ بلکہ اس کے ہاتھ میں روپیہ تھمانے کے لئے۔

وسیم نے حیرت سے پاگل ہوتے ہوئے ابا جان کو دیکھا تو ان کے چہرے پر خفیف سی مسکراہٹ نے اسے یقین دلا دیا کہ باقی سب خیریت ہے۔ اور اس کا مستقبل سزا سے اسی طرح محفوظ ہے جس طرح ابا کا خالہ جان کے خراٹوں اور بسیار خوری سے ـــــ

8

آج صبح سے بارش ہوئے جا رہی تھی۔ اور وسیم گھر بیٹھے بیٹھے اور اپنے اہل خانہ کی جھڑکیاں سنتے سنتے عاجز آ چکا تھا۔ وہ کچھ بھی کرتا' گھر والے اسے ڈانٹ پھٹکار کا حقدار ضرور سمجھتے ـــــــ

"ابا جان۔ میں کیا کروں اب" وہ کوئی دسویں دفعہ کلیم صاحب کے پاس گیا۔ تو انہوں نے تندہی سے کہا "کچھ نہیں" بھاگ جاؤ یہاں سے"

اور امی کے پیچھے پیچھے چلتا کچن میں آ گیا۔

"امی۔ آخر کیا کروں ـــــــ"

"تم کہیں چپ چاپ بیٹھ نہیں سکتے؟ "امی نے تحمل سے کہا۔

"یہ کچھ کرنا تو نہ ہوا" وہ مایوس ہو کر بولا" اور میں تو کچھ نہ کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ بیٹھنا نہیں چاہتا بالکل ـــــــ"

"اچھا جاؤ بیٹھ کر پڑھو یا ڈرائنگ کرو ـــــــ"

"میں نے ڈرائنگ کر لی ہے۔ اور ..... اور پڑھ بھی لیا ہے" وہ صاف جھوٹ بول گیا۔

"اچھا پھر آؤ میرے ساتھ سلائیاں بنو بیٹھ کر" امی نے مسکرا کر دعوت دی۔ تو وہ جل بھن کر وہاں سے نکل گیا۔ اپنے بزرگوں کے غبی پن پر جھلاتا وہ آپا بینا کے کمرے میں گیا۔ شاید وہ اس کا مسئلہ حل کر سکیں گو ان سے کسی بھلائی کی امید تو نہ تھی۔ مگر خیر.....

بینا آپا ہاتھ ہلا ہلا کر اپنی ایک سہیلی کو کسی فلم کی کہانی سنا رہی تھیں اسے اندر آتے دیکھا تو ماتھے پر تیوری چڑھا کر خاموش ہو گئیں۔

"کیا بات ہے وسیم؟" سہیلی نے محبت سے پوچھا۔

"کچھ نہیں" وسیم نے قدرے درشتی سے کہا۔ اور ایک جانب دیوان پر بیٹھ گیا۔

"وسیم بھیا۔ جب تم باہر جاؤ تو جاتی دفعہ دروازہ بند کرتے جانا" بینا نے بڑی ڈپلومیسی سے کہا تو وسیم کے تن من میں آگ لگ گئی۔ وہ بڑے وقار سے اٹھا اور دروازے کے قریب جا کر کہا۔

"آپا ـــــ اب میں کبھی تمہارے کمرے میں نہیں آؤں گا۔ بلاؤ گی۔ منتیں کرو گی۔ جب بھی نہیں ـــــ" یہ کہہ کر اس نے کھٹاک سے دروازہ بند کیا اور ڈرائنگ روم کا رخ

کیا۔

یہاں نعیم میاں۔ اپنے دو چار دوستوں کے ساتھ بیٹھے گپ لڑا رہے تھے۔ باتوں کا موضوع ان کی نئی رائفل تھی۔ وہ بڑے فخر سے اپنے دوستوں کو دکھا کر کہہ رہے تھے "ایسی عمدہ رائفل ہے کہ اس کا نشانہ ....."

وسیم کو آتے دیکھ کر وہ ٹھٹک گئے "کیوں کیا کام ہے؟" انہوں نے سختی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" وسیم نے کہا۔

"تو پھر بھاگ جاؤ ------"

وسیم نے ان کے مشورے پر صدق دل سے عمل کیا۔ اور ذرا سی دیر میں وہ پھر امی کے پاس بیٹھا ان کے کان کھا رہا تھا۔

"امی میں باہر چلا جاؤں؟ اس نے پوچھا۔

"نہیں بیٹے - باہر بڑی سخت بارش ہو رہی ہے" انہوں نے کھڑکی سے جھانکتے ہوئے کہا۔

"تو پھر کیا ہوا--------"

"بے وقوف مت بنو-------- بارش میں باہر نہیں جاتے"۔

"کیوں -------- کیوں نہیں جاتے --------" اس نے ضد کی۔

"اس لیے بیٹے" انہوں نے بردباری سے کہا "کہ بھیگ کر بیمار پڑ جاتے ہیں۔"

وسیم نے مایوس ہو کر سوچا۔ کہ اس کے والدین شاید دنیا بھر میں سب سے زیادہ بے تکے ہیں۔ بے تکے اور ظالم-------

"اچھا امی" اس نے کچھ دیر غور کرنے کے بعد کہا" میں پڑوسیوں کے گھر چلا جاؤں گا؟

"نہیں -------" مختصر سا جواب ملا۔ "ابھی نہیں"۔

"اچھا پھر کب؟"

امی کا ضبط جواب دے رہا تھا۔ انہوں نے قدرے جھلا کر کہا "جاؤ اپنے ابا سے پوچھو" اور وہ ابا کے پاس حاضر ہوا۔

"اب پھر آ گئے ہو سر کھانے؟" انہوں نے بیزاری سے کہا۔

"نہیں ------" وہ جلدی سے بولا "ابا جان میں تو صرف یہ پوچھنے آیا تھا کہ اپنے دوستوں کو بلا لوں؟"

"نہیں۔ ہرگز نہیں۔" انھوں نے سختی سے جواب دیا۔ "وسیم تم کوئی کام کیوں نہیں کرتے؟"

وسیم کے صبر و ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔

"جو کام میں کرنا چاہتا ہوں وہ آپ نہیں کرنے دیتے" وہ بولا اور جو کام میں نہیں کرنا چاہتا۔ وہ آپ کہتے ہیں کہ کرو -------- ابھی امی کہہ رہی تھیں کہ بیٹھ کر سلائیاں بنو----"

کلیم صاحب نے ایک لمحہ کے لیے جوش و خروش کو دیکھا۔ پھر کھڑکی میں جھانکتے ہوئے بولے "شکر ہے خدا کا۔ بارش رک گئی ہے۔ جاؤ باہر جا کر کھیلو۔"

وسیم باہر چلا گیا۔ جہاں بے شمار دلچسپیاں بکھری پڑی تھیں۔ مثلاً سڑک کے ننھے ننھے گڑھوں میں پانی بھر گیا تھا جہاں وہ مزے سے ننگے پاؤں چھپ چھپ کر سکتا تھا۔

ادھر جھاڑیوں پر بارش کی ان گنت بوندیں محض اس انتظار میں اٹکی ہوئی تھیں کہ انہیں جھکورا دے کر بارش کا مزہ لیا جائے۔ گیٹ کے ساتھ والا گڑھا پانی سے لبریز تھا۔ وسیم اس پر سے متعدد بار کودا اور نہایت محظوظ ہوا۔ فٹ پاتھ سے ملحقہ زمین کچی ہونے کی وجہ سے کیچڑ بن گئی تھی۔ وہ بوٹوں سمیت کئی دفعہ اس میں سے گزرا---- اب گھر والوں کے سلوک کی وجہ سے پیدا شدہ بدمزگی قدرے دور ہو گئی تھی' تاہم وہ اپنی باقی ماندہ بوریت دور کرنے کے لیے سوچ رہا تھا کہ دوستوں کی پارٹی کی جائے۔ ہفتے کے روز سارے گھر والوں نے ایک شادی پر جانا تھا۔ مدعو تو وہ بھی تھا۔ مگر اس نے سوچ لیا تھا کہ ہرگز نہیں جائے گا۔ اور اس زریں موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دوستوں کو گھر پر بلائے گا---

شام کو وہ بھیگا ہوا کیچڑ میں سنا ہوا واپس گھر آیا تو متوقع پارٹی کے خیال سے خوش و خرم تھا۔

ابا جان نے پارٹی کے متعلق پوچھا تو انہوں نے سختی سے کہا۔ "نہیں تم نہیں دے سکتے"

دوسرے روز وسیم کلاس میں بھی اس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کی غیر حاضر آنکھیں دیکھ کر ٹیچر نے پوچھا۔

"بھلا میں ابھی کیا کہہ رہی تھی وسیم-؟"

اب یہ بڑا ٹیڑھا سوال تھا جو اس کی اکثر ٹیچرس پوچھتے رہنے کی عادت بد میں گرفتار تھیں۔ بھلا دوسروں سے کیوں نہیں پوچھتیں-؟ مگر یہ وقت ان باتوں پر غور کرنے کا نہ تھا۔ اس نے سر کھجایا اور قدرے سوچ کر بولا۔

"کچھ اسم اور فعل کے متعلق؟ اسے کم از کم اتنا تو یاد تھا کہ یہ گرامر کا پیریڈ ہے۔ اس قابل فخر یادداشت پر اسے شاباش ملنی چاہیے تھی۔ مگر زمانے کی ناقدری کو دیکھیے کہ الٹا اسے ڈانٹ پڑی

"یہ میں کب کا پڑھا چکی ہوں" ٹیچر نے درشتی سے کہا۔ "تم غور سے سنو تو پتہ بھی چلے نا ------ ہاشم۔ تم اسے بتاؤ جو میں ابھی سمجھا رہی تھی۔"

ہاشم چونک کر سیدھا ہو گیا۔ ورنہ ابھی وہ ایک مکھی پکڑ کر نب کر مدد سے دوات میں ٹھونسنے لگا تھا۔

"نفی جمع سے ایک مثبت بنتی ہے" اس نے مشینی انداز میں دہرا دیا۔

"وسیم تم بھی دہراؤ اسے" ٹیچر نے حکم دیا۔ وسیم کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ وہی فقرہ دہرا دیا۔

"اچھا اب بتاؤ نفی کسے کہتے ہیں۔" ٹیچر بھی آج اسے ستانے پر تلی ہوئی تھی۔

"تفریق کو؟" اس نے معصومیت سے کہا۔

"نہیں" ٹیچر نے دانت پیس کر کہا۔ "سنو۔ نفی کہتے ہیں "نہ" یا "نہیں" کو ---- سمجھ میں کہ نہیں؟"

"جی -------- وہ نرمی سے بولا۔

"آسانی کے لیے یہ سمجھ لو ---- کہ دو دفعہ نہیں کہنے کا مطلب ہے ہاں ------ مثلاً اگر تم یہ کہو میں تم سے ناخوش نہیں تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ میں تم سے راضی ہوں ------"

وسیم سوچنے لگا۔ تب اچانک اس پر ایک انکشاف ہوا۔ "مس میں سمجھ گیا ہوں۔" وہ مسکرایا "جب ایک فقرے میں دو دفعہ "نہیں" آئے تو اس کا مطلب "ہاں" ہوتا ہے ------"

"بالکل" ٹیچر نے اطمینان کا سانس لیا اور آگے پڑھانے لگی۔ مگر وسیم آہستہ آہستہ اسی فارمولے کو دہرا رہا تھا۔ چھٹی کے وقت اس نے بڑی بے نیازی سے ہاشم' فری' جواد' وکی وغیرہ کو ہفتے کے روز پارٹی کی دعوت دے دی - جو فوراً قبول کر لی گئی۔ وسیم مطمئن ہو کر گھر چلا آیا۔ اب ابا سے اجازت لینے کی ضرورت باقی نہ رہی تھی۔ وہ تو پہلے ہی کہہ چکے تھے۔

"نہیں تم نہیں دے سکتے پارٹی ------" یعنی تم پارٹی دے سکتے ہو! ہفتے کے دن صبح صبح ہی سب شادی پر جانے کے لیے تیار ہونے لگے تو امی نے ایک دفعہ پھر پوچھ لیا۔

"وسیم بیٹے۔ تم کیوں نہیں چلتے ہمارے ساتھ؟ اداس تو نہ ہو جاؤ گے اکیلے گھر میں؟"

"نہیں امی۔ بالکل نہیں" اس نے سچ بول دیا۔

"اچھا۔ ہمارے پیچھے کوئی شرارت نہ کرنا -------"

"اچھا امی جان" وہ سعادت مندی سے بولا۔

چنانچہ اسے کچھ مزید نصیحتیں کر کے وہ لوگ چلے گئے۔ باورچن کو بھی چھٹی دے دی گئی تھی۔ البتہ امی نے صبح ہی صبح پراٹھا انڈا تلوا کر اس کے لئے نعمت خانے میں رکھ دیا تھا۔ ساتھ تھوڑا سا ہنٹر بیف اور پیسٹریاں بھی تھیں۔ یہ چیزیں وسیم کو بے حد پسند تھیں۔

دوپہر کے کھانے کے بعد مالی بھی اپنے کوارٹر میں جا کر سو گیا۔ اب میدان صاف تھا۔ سوائے ایک بوڑھی مغلانی کے اور کوئی گھر میں نہ تھا۔ ----- مہمان آنے شروع ہو گئے۔ صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس' بال بنائے' پالش شدہ بوٹ پہنے وہ کتنے تمیزدار نظر آ رہے تھے وسیم نے بشاشت سے انہیں سڑک پر جا کر خوش آمدید کہا -------- کچھ دیر تو وہ تمیزدار بنے رہے لیکن یہ تمیزداری اور تہذیب کا ملمع جلد ہی اتر گیا۔ اور انہوں نے ادھر ادھر سے ٹوٹے پھوٹے ٹین کے ڈبے اکٹھے کیے۔ انہیں چھڑیوں پر اٹکایا۔ اور پھریروں کی طرح انہیں لہراتے گیٹ میں سے اندر داخل ہوئے۔ وسیم آگے آگے بگل بجاتا چل رہا تھا جو اس نے کچھ روز ہوئے ایک بھولے بھٹکے پھیری والے سے خریدا تھا اور جسے گھر میں بجانے کی سخت ممانعت تھی۔ اس وقت وہ آزادی کے نشے میں سرشار تھے اور خوب شور مچا رہے تھے۔ بوڑھی مغلانی جو برآمدے میں اونگھ رہی تھی اور جسے وسیم پر کڑی نظر رکھنے کی تاکید کی گئی تھی۔ فرائض کی بجا آوری کے لیے اٹھی مگر یہ عظیم الشان جلوس دیکھ کر کچھ سہم سی گئی۔ تاہم اس نے ہمت کر کے کہا" وسیم بیٹے۔ باغ میں مت چلو۔ سارے پھول نگوڑے پاؤں تلے روندے جائیں گے اور یہ کون ہیں تمہارے ساتھ؟"

"میرے دوست" وسیم نے جواب دیا "چائے پینے آئے ہیں" مگر کیوں۔ بڑے صاحب نے تو منع کر دیا تھا۔ تم....."

"انہوں نے کہا تھا کہ بے شک پارٹی کر لو" وسیم نے وثوق سے کہا۔

"مجھے پتہ ہے انہوں نے یہی کہا تھا-------" مس فیروز کہتی تھیں کہ دو نفی جمع کرو تو ایک ہاں بنتی ہے-----"

بے چاری مغلانی کچھ نہ سمجھ سکی - چپکے سے برآمدے میں جا کر اپنی پلنگڑی پر پڑ گئی۔ اپنی طرف سے اس نے فرض ادا کر دیا تھا۔

"آؤ دشمن دشمن کھیلیں" وسیم نے بشاشت سے اپنے ساتھیوں کو دعوت دی۔

"مگر یار پہلے چائے تو پلاؤ" ایک بے تکلف دوست نے کہا۔

"اچھا۔ مگر ہمیں خود بنانی پڑے گی۔ باورچن چھٹی پر چلی گئی ہے ---- اور مغلانی کچھ بنا کر دے گی نہیں -------" وسیم نے فکر مند ہو کر کہا۔ دوستوں کے منہ ذرا دیر کو لٹک گئے۔ مگر

فوراً ہی اس دل کش خیال سے بحال ہو گئے کہ چائے اور اس کے لوازمات خود تیار کرنے ہوں گے جو ایک بہت ہی گراں قدر بات تھی۔ یعنی کچن پر مکمل کنٹرول ------ وہ بھاگتے دوڑتے' ایک دوسرے کو دھکیلتے کچن میں جا گھسے۔

سب سے پہلے پھل کے ڈبوں پر ہلہ بولا گیا۔ جو نہایت نفاست سے الماری میں چنے ہوئے تھے۔ کچھ روز ہوئے وسیم کے ماموں جان حج پر سے ان کے لیے ایک درجن ڈبوں کی سوغات لائے تھے اور کلیم صاحب نے بڑی محنت سے انہیں الماری میں اوپر تلے سجایا تھا۔

ایک ڈبہ اتارنے کے لیے انہوں نے ابھی تختے کا سہارا لیا ہی تھا کہ جانے کیا گڑبڑ ہوئی جو سارے کے سارے نیچے آن پڑے مگر ان کی پروا کسے تھی۔ اپنے مطلب کا ایک ڈبہ لے کر انہوں نے اسے چاقو کے ذریعے کھولنا شروع کیا۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔

"یار۔ وہ جو کین او پنر ہوتا ہے نا۔ اس سے کھولو" ہاشم نے صلاح دی۔ اس پر وسیم نے فوراً اس کار آمد اوزار کی تلاش شروع کر دی۔ ذرا دیر بعد مطلوبہ ہتھیار مل گیا۔ تو نئے سرے سے ٹین کھولنے کی مہم شروع ہوئی۔ آخر بڑی دقتوں سے' دو چار کے ہاتھ زخمی کرنے کے بعد ڈبہ کھل سکا۔ اس میں محفوظ کیے ہوئے پھل واقعی بڑے خوشبو دار اور اشتہا انگیز تھے۔ انہیں پلیٹ میں الٹ کر وہ سب کانٹوں چمچوں سے لیس ہو کر پل بڑے چند سیکنڈ بعد میدان صاف تھا۔ اب دوسری چیزوں کی تلاش شروع ہوئی۔ آخر فریج میں سے کچھ پیسٹری' کل کا بچا ہوا حلوہ' اور کچھ پھل مل گئے۔ الماری میں تولیے کے اندر لپٹی ہوئی آدھی ڈبل روٹی بھی دستیاب ہو گئی۔ اب صرف چائے کا مسئلہ تھا۔

"میں نے باورچن کو کئی دفعہ چائے پکاتے دیکھا ہے" فرخ نے بتایا۔

"یوں کرتی ہے۔ پانی ابال کر اس میں چائے کی پتیاں ڈال دیتی ہے بس چائے تیار ------"

"مگر آگ۔ آگ کون جلائے گا" سعید منمنایا۔

یہ مسئلہ واقعی غور طلب تھا۔ سب دانشور سر جوڑ کر اسے حل کرنے لگے۔ بڑے غور و خوض کے بعد گیس کا چولہا خارج از بحث قرار پایا۔ کیوں کہ اسے جلانا کوئی نہیں جانتا تھا۔

"ہمارے گھر میں ایک کوئلوں کی انگیٹھی بھی ہے" وسیم نے بتایا "کبھی گیس کا چولہا خراب ہو جائے تو اس میں کوئلے ڈال کر باورچن اوپر مٹی کا تیل ڈال دیتی ہے۔ پھر ماچس کی تیلی جلا کر آگ لگا دیتی ہے بس ---- چٹکی بجا کر۔ فائنٹ آگ جل جاتی ہے"

"بس یہ ٹھیک ہے" فرخ نے کہا "ہم یہی جلائیں گے" چنانچہ انگیٹھی جلانے کی تیاریاں

شروع ہو گئیں۔ وسیم الماری میں سے بوتل اٹھا کر بھاگا گیا اور ٹین میں سے تیل نکالنے لگا۔ اس کوشش میں آدھا تیل نیچے فرش پر گر گیا۔ مگر آخر کافی جدوجہد کے بعد وہ بوتل بھرنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ گو اس کوشش میں اس نے اپنی نئی ورسٹڈ کی پنٹ اور سفید کلف دار قمیض پر بھی کافی تیل گرا لیا۔

"لو بھئی یہ ہے تیل ------" اس نے فتحمندانہ انداز میں بوتل لا کر ہاشم کو پکڑا دی۔ جو کوئلوں کی بوری میں سے ایک بڑا سا ٹکڑا نکال کر اسے مصالحہ پیسنے والے ڈنڈے سے توڑ رہا تھا۔ نیچے چپس کا فرش کالا سیاہ ہو گیا تھا۔ اور ارد گرد' دو دو گز کے فاصلے تک سارے کوئلے کے ٹکڑے بکھرے پڑے تھے۔ خود ہاشم صاحب کی سلیٹی قمیض کے استری شدہ کف بالکل کالے ہو رہے تھے۔ چہرے اور ہاتھوں کی حالت بھی ناگفتہ بہ تھی۔

پاس ہی وکی میاں ماچس لیے تیار کھڑے تھے۔

انگیٹھی کوئلوں سے بھر گئی تو اس پر مٹی کے تیل کی پوری بوتل انڈیل دی گئی۔ اب آگ دکھانے کا مرحلہ تھا۔

"بھئی ماچس میں نہیں جلاؤں گا۔ تم جلاؤ۔" ہاشم نے وکی سے کہا۔ مگر انہوں نے صاف انکار کر دیا۔

"بڑے افسوس کی بات ہے یار وکی" مسعود نے ڈانٹ پلائی۔

"تم کبھی کوئی کام نہیں کر کے دیتے۔ لاؤ میں جلاتا ہوں۔"

انہوں نے تیلی جلا کر کوئی چار گز دور جا کر انگیٹھی میں پھینک دی مگر نشانہ خطا گیا۔ پھر یہ عمل دہرایا گیا۔ آخر کوئی دس بیس تیلیاں ضائع ہونے کے بعد ایک تیلی انگیٹھی کے عین درمیان جا گری۔ اور شعلہ بھڑک اٹھا۔ تو سب کارکنوں نے اطمینان کی سانس لی۔ انگیٹھی خوب مزے سے جل رہی تھی۔ ادھر وسیم میاں ایک بڑی سی دھلی دھلائی پتیلی میں پانی بھر کر لے آئے۔ اور اسے انگیٹھی پر رکھ دیا' اب چائے کی ڈھنڈ پڑ گئی۔ آخر الماری کے اوپر والے خانے میں بسکٹوں کے ایک خالی ڈبے میں پڑی ملی۔ اس جدوجہد میں کئی برتن گرے۔ کئی پڑیاں کھلیں۔' کئی چیزیں بکھریں۔ مگر شئے مطلوب مل گئی۔ یہی کافی تھا۔

کوئی ایک گھنٹہ بعد سب دوست کھانے کی میز پر بیٹھے دعوت اڑا رہے تھے۔ پلیٹوں میں مختلف قسم کی اشیائے خوردنی کے ڈھیر لگے تھے جن میں کریم' گاجریں' سنترے اور پچھلی کیاریوں سے اکھاڑے ہوئے شلغم بھی شامل تھے۔

بڑی سی چائے دانی میں ایک گہرا کالا سیال پڑا تھا۔ جسے انہوں نے چائے کا نام دے رکھا تھا۔

اور اس میں فریج سے نکالا ہوا ٹھنڈا دودھ ملا ملا کر پی رہے تھے۔

دعوت تمام ہوئی تو شادماں و مسرور گروہ باہر نکلا۔ مگر اس حلیے میں کہ سب کے چہروں پر حصہ رسدی کوکلوں کی سیاہی' اور مٹی کے تیل سے گلکاری سی ہو رہی تھی۔ کپڑوں کی حالت بھی ابتر تھی۔

کچھ دیر پہلے کی صاف ستھری قمیضوں پر سیاہ داغ اور طرح طرح کے دھبے نظر آمد ہے تھے۔ بال پریشان تھے۔ اور پالش شدہ بوٹوں پر خاک ہی خاک تھی۔ مگر انہیں اپنے حلیے کی ذرا بھی پروا نہ تھی' سب کے پیٹ بھرے ہوئے اور دل خوش و خرم تھے

باہر جا کر دشمن دشمن کا کھیل شروع ہوا۔ دو گروہ بن گئے۔ پتھروں اور ڈھیلوں سے ایک دوسرے پر چاند ماری کی گئی۔ یہ پتھر انہیں لگنے کی بجائے عموماً ادھر ادھر کھڑکیوں اور دروازوں پر ہی لگتے رہے۔ نتیجتہ" دو تین کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ گئے۔ اس کھیل سے اکتا گئے تو چھپن چھپائی شروع ہوئی۔ پہلے جب بزرگوں کی نگرانی میں یہ کھیل کھیلا جاتا تو طرح طرح کی نصیحتیں کی جاتیں "اندر کمروں میں مت کھیلو" ——" کچن میں نہ گھسنا برتن ٹوٹ جائیں گے۔ اتنا مت چیخو—— اور ڈرائنگ روم میں قطعی نہیں جانا—— وغیرہ"

مگر آج تو اپنا راج تھا۔ لہٰذا ان تمام احکام کی خلاف ورزی خوب جی بھر کے کی گئی۔ سیڑھیوں پر چڑھے' اترے' سارے بیڈ روموں اور ڈرائنگ روموں وغیرہ میں گھسے اور قالینوں پر کیچڑ کے نقش و نگار کا اضافہ کرتے رہے' ایک آدھ ڈیکوریشن پیس بھی اسی ہلڑ بازی کی نذر ہو گیا۔ مگر کھیل اپنی پوری آزادی اور جمہوری سپرٹ میں جاری رہا۔

فرخ کو میاں نعیم کے صاف ستھرے بستر میں چھپنے کی بڑی آئیڈیل جگہ نظر آئی۔ لہٰذا نہایت بے تکلفی سے بوٹوں سمیت اس میں گھس گئے ادھر مسعود صاحب بینا کی وارڈ روب میں جا چھپے۔ اور اس کے نرم و نازک ریشمی کپڑوں کی نہ صرف تہ بگاڑی بلکہ انہیں مٹی میں سان دیا۔

وکی میاں ڈرائنگ روم کا دروازہ جو بند کرنے لگے تو اس کا ہینڈل جو پہلے ہی ڈھیلا تھا۔ ہاتھ میں آ گیا۔ اسے انھوں نے غیر ضروری چیز سمجھ کر وہیں پھینکا اور مزے سے صوفے کے پیچھے چھپ گئے۔

جواد وسیم سے بچنے کے لیے سرپٹ بھاگے تو ڈرائنگ روم کے پردے سے الجھ گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پردہ مع اپنے پیتل کے ڈنڈے کے نیچے آن گرا۔ یہ شکر ہے وہ خود بچ گئے۔ البتہ پردے میں الجھ جانے کے باعث کپڑے ضرور گئے' جس کا انہیں سخت افسوس ہوا۔

اوپر کی کھڑکی میں سے ہاشم پر آلو پھینکتے ہوئے وسیم کی نظر اچانک گیٹ پر پڑی تو اس کا ہاتھ

اٹھے کا اٹھا رہ گیا۔ گیٹ میں سے گھر کی سفید کار داخل ہو رہی تھی۔ جس میں سب افراد خانہ تھے ——— کوئی دو گھنٹے کے بعد پڑوسیوں کی لڑکی بلی جب ان کے ہاں آئی تو وسیم اپنے کمرے میں بند کھڑکی میں سے جھانک رہا تھا۔

"وسیم۔ باہر آؤ۔ کھیلیں" بلی نے دعوت دی۔

وسیم نے بکھرے بالوں والا سر زور سے ہلایا۔ اور اداسی سے بولا۔

"نہیں ———"

"کیوں ——— اور تم اندر کیوں گھسے ہوئے ہو وسیم ——— باہر کیوں نہیں آتے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری ———؟"

"ٹھیک ہے۔ ویسے میں اب سونے لگا ہوں" وسیم نے منہ تھتھماتے ہوئے کہا۔

"وہ کیوں"

"اس لیے کہ ابا کو گرامر نہیں آتی۔ بالکل نہیں آتی" اور اس نے کھڑکی بند کر دی۔

9

"وسیم تمہیں ہزار بار منع کیا ہے۔ کہ یہ کم بخت کھیل نہ کھیلا کرو۔ مگر تم باز نہیں آتے" مسز کلیم نے درشتی سے کہا۔

"کون سا کھیل امی جان" وسیم نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

"یہی۔ شیر شیر والا" انہوں نے بیزاری سے کہا۔

"مگر امی ہم نے شیر شیر تو نہیں کھیلا ہے آج۔ وسیم نے وثوق سے کہا۔ ہم نے تو چیتا چیتا کھیلا ہے آج۔ آپ نے منع کیا تھا نا کہ شیر شیر نہ کھیلنا اسی لیے ہم نے ....."

تو اس میں تم لوگ کیا کرتے ہو بھلا" مسز کلیم نے پوچھا۔

"اس میں؟" وسیم نے جوش سے کہا" اس میں دو پارٹیاں بن جاتی ہیں۔ آدھے لڑکے چیتے اور آدھے آدمی بن جاتے ہیں۔ پھر ایک دوسرے کو پکڑتے ہیں۔ بس"

"یہی کچھ تو تم شیر شیر والی گیم میں کرتے تھے" مسز کلیم نے قدرے سختی سے کہا "پھر فرق ہی کیا ہوا ان دونوں کھیلوں میں۔"

"کیوں فرق کیوں نہیں" وسیم نے زور دے کر کہا "وہ شیروں کا کھیل تھا یہ چیتوں کا ہے۔ شیر شیر ہوتے ہیں اور چیتے چیتے۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ چڑیا گھر میں بھی دونوں کے الگ الگ پنجرے میں ہوتے ہیں۔ اگر ان میں فرق نہ ہوتا تو....."

"اچھا خیر" مسز کلیم نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا "تم آج سے یہ سن لو۔ کہ آئندہ تم چیتے چیتے والا کھیل بھی نہیں کھیلو گے۔ اور اب ذرا جا کر منہ ہاتھ دھوؤ اور کپڑے بدلو ——"

"منہ دھوؤں؟" وسیم کو گویا اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ "امی میں نے صبح منہ دھویا تھا۔ اب پھر....."

"ذرا آئینے میں جا کر دیکھو۔ پھر تمہیں پتہ چل جائے گا کہ میں کیوں تمہیں منہ دھونے کو کہہ رہی ہوں ——"

وسیم بڑی فرماں برداری سے ان کی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جا کر آئینے میں اپنا منہ دیکھنے لگا۔ بڑے اشتیاق اور دلچسپی سے اس نے اپنے مٹی میں سنے چہرے' دھبوں والی قمیض اور گرد و غبار میں اٹی نیکر کو دیکھا وہیں کھڑے کھڑے دونوں ہاتھوں سے چہرہ پونچھ کر اس نے ذرا بال

سنوار لیے۔

"کیوں امی۔ اب ٹھیک ہوں نا؟" اس نے پیچھے مڑ کر فاتحانہ انداز میں پوچھا

"نہیں بیٹے۔ تم جا کر غسل خانے میں منہ ہاتھ دھوؤ اور کپڑے بدلو۔"

مسز کلیم اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنے کو تیار نہ تھیں۔ لہٰذا بادل نخواستہ وسیم کو غسل خانے کا رخ کرنا پڑا۔ دس منٹ بعد سجا سنورا وہ امی کی نظر بچا کر باہر جانے ہی والا تھا۔ کہ انہوں نے آواز دی" وسیم ادھر آؤ ——"

وہ پاس آ گیا۔ اس کی کایا ہی پلٹی ہوئی تھی چہرہ اور بال چمک رہے تھے زرد قمیض اور چیک نیکر میں وہ بے حد سمارٹ نظر آ رہا تھا۔ جوتے صاف ستھرے تھے۔ مسز کلیم خوش ہو گئیں۔ مگر وسیم کے چہرے پر ویسی ہی خفگی تھی۔

"اب ٹھیک ہے" مسز کلیم نے تحسین آمیز لہجے میں کہا "آؤ میرے پاس بیٹھ جاؤ۔ اور چائے کے وقت تک بیٹھ کر پڑھو۔ کہیں باہر جانے کی ضرورت نہیں ورنہ پھر گندے ہو کر آ جاؤ گے۔"

"یہاں بیٹھوں؟" وسیم نے ارد گرد کے شدید مہذب ماحول کو دیکھ کر فریاد کی۔

"ہاں۔ کیا ہرج ہے۔ صرف چائے کے وقت تک۔ پھر تمہیں باہر جانے کی اجازت ہو گی۔

مسز کلیم نے نرمی سے سمجھایا۔ اور اسے ایک مزے دار کہانیوں والی کتاب پڑھنے کو دی۔

وسیم سخت بیزار ہو کر ان کے پاس ہی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ اور بے دلی سے کتاب کھول کر گھٹنوں پر رکھ لی۔ مگر وہ پڑھ ایک لفظ بھی نہیں رہا تھا۔

اتنے میں امی کی ایک بے حد پونٹڈ ملنے والی مسز نقوی آ گئیں یہ بڑی مہذب' شائستہ' خوش لباس اور ہنس مکھ خاتون تھیں۔ آتے ہی ان کی نظر بنے سنورے وسیم پر پڑی تو پاس آ گئیں۔

"افوہ کتنا پیارا بچہ ہے" انہوں نے اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "مسز کلیم یہ آپ کا چھوٹا بیٹا ہے؟ میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا" وسیم نے اپنا سر ایک جھٹکے سے پرے کر لیا۔ اسے یہ خاتون اور دنیا کا ہر فرد اس وقت زہر لگ رہا تھا۔

"اور پڑھ کیا رہے ہو بیٹے؟" مسز نقوی نے بڑی محبت سے کتاب لیتے ہوئے کہا "اچھا شاہکار کہانیاں' واہ بھئی۔ بڑی اچھی کتاب ہے یہ تو ——"

مسز کلیم کو وسیم کے مزاج کا اندازہ تھا۔ انہوں نے جلدی سے اسے باہر جانے کی اجازت دے دی اور مسز نقوی کو اپنے پاس بٹھا لیا۔ مگر مسز نقوی پر تو وسیم نے گویا سحر کر دیا تھا۔ صفائی

سے برش کیے بالوں، گلابی چہرے اور صاف ستھرے کپڑوں والا بچہ یہ انہیں بے حد پیارا لگا تھا۔ انہیں ویسے بھی بچوں سے پیار تھا۔ شاید اس لیے کہ ان کا اپنا کوئی بچہ نہ تھا۔

"مسز کلیم۔ اپنے بیٹے کو کسی روز میرے ہاں بھیجئے۔ میں بے حد مشکور ہوں گی، کتنا پیارا بچہ ہے ماشاء اللہ۔ نام کیا ہے اس کا؟"

"وسیم ـــــــ"

"نام بھی کتنا اچھا ہے۔" وہ مسکرائیں۔ "دیکھئے بھولیے گا نہیں اسے میرے گھر ضرور بھیجیں"ـــــــ

اب مسز کلیم کیا کہتیں۔ انہیں اپنے لاڈلے کی عادات کا خوب علم تھا۔ وہ کبھی بھی ایک مہذب خاتون کے پاس پابند ہو کر بیٹھنا پسند نہ کرتا ـــــــ

"دراصل۔ میرا خیال ہے" وہ قدرے ہچکچا کر بولیں "وہ ذرا شیطان سا لڑکا ہے۔ آپ کو تنگ نہ کرے۔"

"نہیں نہیں۔ بالکل تنگ نہیں کرے گا۔ اتنا تو تمیز دار بچہ ہے" مسز نقوی نے اس کی وکالت کرتے ہوئے اصرار کیا۔ اب ظاہر ہے مسز کلیم کیا کہہ سکتی تھیں۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر مسز نقوی چلنے کو تیار ہوئیں تو مسز کلیم انہیں چھوڑنے گیٹ تک آئیں۔ یہاں وسیم پہلے ہی گیٹ کے پاس کھڑا اپنی بوریت دور کرنے کوشش کر رہا تھا۔

"اوہ وسیم پیارے۔ تم میرے گھر آؤ گے نا؟" مسز نقوی اسے پیار کرنے کی نیت سے آگے بڑھیں۔ تو وہ پرے ہٹ گیا اور بڑی نفرت اور بیزاری سے انہیں گھورا۔ مگر مسز نقوی بھی مایوس ہونے والوں میں نہ تھیں۔

"ہائے کتنا شرمیلا ہے۔" انہوں نے لہک کر کہا "بھئی کچھ کہئے۔ مجھے تو شرمیلے بچے بے حد پیارے لگتے ہیں" اور وہ مسکراتی ہوئی رخصت ہو گئیں۔

شام کو مسز کلیم نے اپنے شوہر سے مسز نقوی کی دعوت کا ذکر کیا۔ تو وہ سوچ میں پڑ گئے۔ نقوی ان کے بے حد عزیز دوست تھے۔ چنانچہ ان کی بیگم کا کہا ٹالا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ ادھر وسیم کو بھی وہ خوب جانتے تھے آخر آہستہ سے بولے "بھیجنا تو اس کو پڑے گا ہی۔ اچھا تم یوں کرنا کہ اسے ذرا سمجھا دینا ـــــــ کہ بدتمیزی نہ کرے"

"سمجھا دوں گی" مسز کلیم نے کہا "ویسے میں حیران ہوں یہ کیوں ان سے خار کھاتا ہے۔ اتنی تو وہ دلکش خاتون ہیں۔"

کلیم صاحب مایوسی سے سر ہلا کر رہ گئے۔

آخر وہ دن بھی آ گیا جس روز وسیم کو مسز نقوی کے ہاں جانا تھا۔ مگر بستر سے اٹھتے ہی اسے شدید درد سر کا دورہ پڑ گیا۔

"امی جان" وہ کراہ کر بولا "میں تو اٹھ ہی نہیں سکتا۔ اف ہائے بڑا سخت درد ہے۔"

ناچار مسند کلیم کو کہنا پڑا کہ بستر میں ہی آرام کرے۔ چائے بھی اسے وہیں پہنچا دی گئی۔ البتہ دوپہر کے کھانے تک بھی جب اس کے "سردرد کو آرام نہ آیا تو مسز کلیم نے اس کے لیے صرف شوربہ تیار کرا دیا۔ اور روٹی، سالن، کھیر وغیرہ کو ہاتھ نہ لگانے دیا۔ وسیم کا بھوک کے مارے برا حال ہو رہا تھا۔ مگر جہاں اس بہانے سے مسز نقوی کے ہاں جانے کی چھٹی مل گئی تھی۔ وہیں کھانے سے بھی ہاتھ دھونا پڑا تھا۔ آخر سہ پہر کے نزدیک اس نے امی سے بمشکل "تھوڑی دیر سیر کرنے" کا بہانہ لگا کر کچن کا رخ کیا۔

کوئی آدھ گھنٹہ بعد جب باورچن شام کی چائے تیار کرنے کچن میں گھسی تو وسیم میاں کو دیکھ کر ٹھٹک سی گئی۔ ذرا دیر کی چیکنگ کے بعد اسے معلوم ہو گیا کہ کچن میں کوئی بھی کھانے کے قابل چیز نہیں بچی۔ وہ فوراً بیگم صاحب کے پاس بھاگی گئی۔

"بیگم صاحب اس نے ہانپتے ہوئے کہا "وسیم میاں نے تلی ہوئی دال۔ پیسٹریاں، نمک پارے سب کچھ کھا لیا۔ کوئی چیز نہیں چھوڑی۔ وہ آلو بھی کھا لیے جو میں نے چاٹ کے لیے ابالے تھے"۔

مسز کلیم کو حقیقت حال کا علم ہو جانے پر وسیم کو فوراً ہی سردرد کے عارضے کو دور کرنا پڑا۔ اتنے میں اس کے دوست آ گئے۔ اور بقیہ سارا دن اس نے انہی کے ساتھ گزارا۔ فرخ کے فاکس ٹیریئر، موتی اور وکی کے ساتھ سیزر کی مدد سے شکار کھیلا گیا۔ شکار تو کیا ملتا۔ البتہ دونوں کتے دیر تک شہد کی مکھیوں اور تتلیوں کے پیچھے بھاگتے رہے۔ بنگلو بند ھا ہوا تھا۔ اس لیے وہ اس تفریح میں شامل نہ ہو سکا۔ دوپہر کے کھانے پر وہ ذرا جلدی ہی ڈائنگ ٹیبل پر پہنچ گیا۔ ابا اور امی ابھی نہیں آئے تھے۔ صرف بینا آپا اور بھائی جان بیٹھے انگلیاں چٹخا رہے تھے۔ وسیم لنگڑاتا ہوا آیا تو اس کے چہرے پر بے پناہ تکلیف کے آثار دیکھ کر نعیم نے ہمدردی سے پوچھا۔

"کیا ہوا وسیم۔ لنگڑا کیوں رہے ہو؟"

"میرے ٹخنے میں موچ آ گئی ہے۔" وہ کراہ کر بولا۔

"اف۔ کون سے ٹخنے میں۔ لاؤ میں آیوڈکس کی مالش کر دوں" نعیم نے پریشان ہو کر کہا۔

"اس .....اس ٹخنے میں" دراصل اسے یاد نہ آ رہا تھا کون سے ٹخنے میں۔

"اچھا۔۔۔ مگر افسوس کہ لنگڑا تم دوسرے پیر سے رہے تھے۔" بینا نے ملامت آمیز لہجے

میں کہا۔

ناچار ہمدردی بٹورنے کا یہ بہانہ بھی چھوڑنا پڑا۔ الٹا ڈانٹ پڑی' آخر امی اور ابا نے سر جوڑ کر فیصلہ کیا کہ وسیم کو انسان بنانے کے لیے "مامن" والی بیگم سلیمان کی تربیت گاہ میں بھیجنا چاہئے۔ ورنہ لڑکا بالکل چوپٹ ہو جائے گا۔ بیگم سلیمان کی یہ تربیت گاہ ایک کلاسیکی قسم کی سخت موڈرن چیز تھی۔ چند شیطان قسم کے لڑکے پہلے ہی اس میں داخل تھے۔ جنہیں روزانہ نئی نئی طرز کے لیکچروں سے واسطہ پڑتا ہے۔ تعلیم و تربیت کا یہ فن بیگم سلیمان امریکہ سے سیکھ کر آئی تھیں۔ وہ خود ایک بزنس مین کی بیوی تھیں اور بے اولاد بھی۔ لہٰذا انہیں بچوں کی تربیت گاہ میں بیٹھ کر بے حد مزہ آتا تھا۔ گو انہوں نے دو چار مزید استانیاں بھی رکھ چھوڑی تھیں۔ تاہم سارا وقت خود ہی بچوں کی نگرانی کرتیں۔ اس آئیڈیل قسم کی تربیت گاہ میں وسیم کو داخل کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

جس شام کو اسے تربیت گاہ میں جانا تھا۔ اسی شام کوئی ڈھائی بجے سے وسیم کو شدید قسم کا دانت درد شروع ہو گیا۔ کسی نے اس کی طرف توجہ نہ دی تو پونے تین بجے کے قریب ٹانگوں میں درد کا نسخہ استعمال کیا گیا۔ یہ بھی کارگر نہ ہوا تو باری باری سر درد' بخار' پیٹ درد وغیرہ کو استعمال کیا۔ مگر افسوس سب ترکیبیں بے کار ہو گیں۔ گھر والے ہوشیار ہو چکے تھے۔

آخر ساڑھے تین بجے اسے تیار ہونا ہی پڑا۔

"وسیم۔ تم بڑے خوش ہو گے وہاں' بیگم کلیم نے اسے پیار کرتے ہوئے تسلی دی۔" بڑا اچھا سکول ہے۔ پڑھائی تو بہت تھوڑی کرواتے ہیں وہ لوگ۔۔۔۔۔ خوب وہاں بچوں سے مل کر کھیلنا۔۔۔۔۔"

وسیم خاموش رہا۔ اتنے میں اس کے نئے نئے درآمد شدہ کتے' بنگو کی جھلک دکھائی دی تو اس کا چہرہ کھل اٹھا۔

"او بنگو" اس نے زور سے پکارا۔ یہ پلا ابا کے کسی دوست کی ایک بے حد نستعلیق کتیا کا فرزند تھا۔ جو اپنے اعلیٰ اخلاق اور اچھی عادات کی وجہ سے آس پاس کے گھروں میں بہت مشہور تھی۔ مگر بنگو صاحب یہاں آکر وسیم میاں کی تربیت میں بالکل اپنی ماں کے برعکس نکلے۔ چنانچہ اس وقت وسیم کے پکارنے پر وہ کچن سے بھاگے آئے تو اس حلیے میں کہ شوربا تھوتنی پر لگا تھا۔ اور ایک نیم چوسی ہوئی ہڈی دانتوں میں پکڑی ہوئی تھی۔ پاس آکر بڑے زور شور سے دم ہلانے لگے۔

"امی۔ میں اسے ساتھ لے جاؤں" وسیم نے پوچھا۔

"نہیں بیٹے" انہوں نے سختی سے کہا۔ "کہیں سکولوں میں کتے بھی جاتے ہیں؟

"کیوں نہیں" اس نے ضد کی "یہ وہاں کوئی شرارت نہیں کرے گا"۔

"لیکن اسے وہاں جانے کی اجازت ہرگز نہیں مل سکتی" امی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا تو وسیم کو خاموش ہونا پڑا۔ ادھر کتا بڑی پر امید نظروں سے منہ اوپر اٹھائے' زبان باہر نکالے۔ انہیں دیکھ رہا تھا۔ نوکرانی کے ذریعے اسے وہاں سے ہٹایا گیا۔ اور وسیم تربیت گاہ کی طرف چل دیا۔ آہستہ آہستہ سر جھکائے' لڑکھڑاتے قدموں سے وہ یوں چل رہا تھا۔ گویا جسم میں سکت ہی نہ ہو۔ رستے میں تین مایوس صورتیں اسے اور ملیں جو اسی منزل کو جا رہی تھیں۔ وہ چاروں آپس میں کچھ نہیں بولے۔ صرف ایک دوسرے کو دیکھ کر ہی انہیں پتہ چل گیا تھا۔ کہ ان کی منزل ایک ہے۔ اتفاق سے بقیہ تین حضرات بھی وسیم کے دوست فرخ' جواد اور ہاشم نکلے۔ آخر تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد انہوں نے تربیت گاہ جانے کے لیے ایک دوسرے کو پرسہ دیا۔ اور باقاعدہ تعزیت کی۔

"میرا گلا خراب تھا۔ پھر بھی انہوں نے مجھے بھیج دیا۔"

فرخ نے ایک ہاتھ سے گردن سہلاتے ہوئے درد ناک لہجے میں کہا۔

"میں بھی بیمار ہوں" جواد نے مظلومیت سے کہا "میں نے بتا بھی دیا تھا انہیں۔۔۔۔۔ پھر بھی کسی نے نہیں سنا۔"

"میرے بھی پیٹ میں درد ہے" ہاشم نے آہ بھر کر کہا۔

"اور میرے بھی۔۔۔۔۔" وسیم نے افسوس ناک لہجے میں کہا "کتنی بری بات ہے کہ ہم سب بیماروں کو ان لوگوں نے زبردستی سکول بھیج دیا"۔

کافی لمبا رستہ اختیار کرنے کے بعد آخر سکول آ ہی گیا۔ چاروں ذرا دیر کو دروازے پر ٹھٹکے۔ پھر بادل نخواستہ اندر جانا ہی پڑا۔

اندر صاف ستھری میزوں کرسیوں پر چند مزید اداس اور غمگین صورتیں بیٹھی تھیں۔ نئے شاگردوں کو دیکھ کر بیگم سلیمان ادھر آ گئیں۔ پیارے بچو۔ آ گئے تم۔"

آؤ آؤ۔ خوش آمدید "پھر مڑ کر پرانے طالب علموں سے مخاطب ہوئیں" بچو۔ یہ تمہارے نئے ساتھی ہیں"

پرانے بچوں نے نئے رنگروٹوں کو بڑی قابل رحم نظروں سے دیکھا اور خاموش رہے بیگم سلیمان نے انہیں ساتھ لے جا کر سیٹیں دکھائیں نئی نئی پالش شدہ کرسیاں بڑی خوبصورت تھیں مگر انہیں سخت بری لگیں۔ تاہم مجبوراً بیٹھنا پڑا بیگم سلیمان نے جا اپنی کرسی سنبھالی اور بڑے دل

آویز اور شریں لہجے میں بولیں۔

"اچھا پیاری منی بیچو۔ اور ننھے سویٹ لڑکو۔۔۔۔۔ تمہارا آج کا پہلا سبق کیا ہے بھلا؟"

"تمیز اور تہذیب" چند ماتمی سی آوازیں سنائی دیں۔

"ہاں۔۔۔۔۔ ٹھیک ہے" وہ مسرور لہجے میں بولیں "تم بھی کہو وسیم' جواد فرغ' اور ہاشم" مگر ان کی طرف کوئی جواب نہ ملنے پر وہ پاس آ گئیں اور ضرورت سے زیادہ میٹھے لہجے میں ان سے مخاطب ہوئیں۔

"اچھا شاباش۔ اب بتاؤ ہمیں کیا بننا چاہیے۔ تمیزدار اور مہذب یا شیطان اور بد تمیز؟"

"تمیزدار اور مہذب" پچھلی سیٹوں سے مشینی طرز کی بور آواز بلند ہوئی جس میں قطعی کوئی ولولہ یا جوش نہ تھا۔

"جیدی پیارے۔ تم بتاؤ" بیگم سلیمان کو بچوں کے نام بگاڑنے میں ملکہ حاصل تھا۔ جواد سرخ پڑ گیا۔ مگر بولا کچھ نہیں۔ اسے نیا طرز تخاطب سخت ناگوار گزار تھا۔

"ارے بڑا شرمیلا ہے تو تو" انہوں نے پیار سے اس کی ٹھوڑی چھو کر کہا "اچھا پیارے وسی۔ تم ہی بتا دو" اور وسیم کو ایسا جی چاہا کہ انہیں قتل کر دے۔ غصے کے مارے اس کا برا حال تھا۔ بیگم سلیمان آخر قدرے مایوس ہو کر ہٹ آئیں۔

ان چاروں نئے بچوں کو بھی بہلانا۔ تاکہ یہ ذرا بے تکلف ہو سکیں اچھا خدا حافظ۔ جانے سے پہلے یہ پوچھتی چلوں کہ آج کن باتوں پر عمل کرنا ہے۔؟"

"ہمیں مہذب' شائستہ' خوش و خرم اور اچھا بننا ہے" پرانے بچوں نے مشینی انداز میں دہرایا۔

وہ مطمئن ہو کر چلی گئیں۔

لیکن جب کوئی پون گھنٹے کے بعد وہ واپس آئیں۔ تو بچے واقعی کھیل رہے تھے لیکن وہ یہ گیم نہ تھی جو وہ بتا کر گئی تھیں۔ بلکہ کچھ اور ہی تھا۔ جس میں سارے بچے مل کر ہلڑ مچا رہے تھے۔ خوب چیخ چلا رہے تھے اور ایک دوسرے کو کاپیاں' کتابیں' یا جو ہاتھ میں آتا اٹھا اٹھا کر مار رہے تھے۔

وسیم نے انہیں دشمن دشمن کھیل سکھا دیا تھا۔ اور وہ اس میں تن من دھن سے مصروف تھے۔ کرسیاں الٹی ہوئی تھیں۔ چیخ و پکار سے کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ سب کے کپڑے پھٹے ہوئے اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ مگر چہروں پر بشاشت تھی۔ ان کی ساری بوریت دور ہو چکی تھی۔

بیگم سلیمان کھڑی تہذیب و شائستگی کا یہ مظاہرہ دیکھتی رہیں اور ہاتھ ملتی رہیں۔ ان کی امن اپیلیں اور قیمتی نصیحتیں بھی بے کار گئیں کوئی سن ہی نہیں رہا تھا۔ ایک غدر مچا ہوا تھا۔ جس میں ہر کوئی گلا پھاڑ پھاڑ کر چلا رہا تھا۔

"اسے مار ڈالو۔۔۔۔۔"

"انہیں پکڑ لو۔۔۔۔۔" گھیر لو۔۔۔۔۔" وغیرہ قسم کی دھاڑوں میں ان کی نفیس و نازک آواز کیا بتاتی تھیں آخر یہ سارا گروہ کمرے کو ناکافی پا کر باہر بھاگ گیا۔ جہاں کھیتوں میں بڑا عمدہ قسم کا میدان جنگ بن سکتا تھا۔ وہاں تو بت دست بدست کشتی تک پہنچی۔ آخر "فیصلہ" ہو جانے پر سب جیالے اپنے اپنے گھروں کو بھاگ گئے۔

بیگم کلیم بڑی بے صبری سے اپنے لخت جگر کا انتظار کر رہی تھیں۔ آخر جب وہ گھر پہنچا تو وہ اس کی اور کپڑوں وغیرہ کی حالت دیکھ کر دم بخود رہ گئیں۔

"وسیم۔۔۔۔۔" انہوں نے پاس آ کر کہا "تم پھر آج چیتے چیتے کا کھیل کھیلتے رہے؟ پڑھائی نہیں کی؟"

"نہیں امی وہ نظریں چرا کر بولا "ہم نے آج مگرمچھ کھیل کھیلا ہے۔۔۔۔۔ مس نے خود ہی کہا تھا کھیلو۔۔۔۔۔" اور وہ اپنے کمرے میں کھسک گیا۔

10

آج ہفتے کی آدھی چھٹی تھیں۔ وسیم اسے منانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ اسی سلسلے میں کھانے پینے کی چیزیں اکٹھی کی جا رہی تھیں۔ پلنگ پر ایک باسی کیک اور دو چار مالٹے پڑے تھے۔ جو وہ صبح صبح بڑی خاموشی سے' باروچن کی نظر بچا کر کچن سے چرا لایا تھا۔

پچھلے ہفتے "باغیوں" نے اپنے ہیڈ کوارٹر میں خوب ہڑبونگ مچائی تھی۔ ان کا ہیڈ کوارٹر کوئی پون میل دور ایک اجڑا پجڑا کھنڈر تھا۔ جس میں نہایت آزادی سے جنگل میں منگل منایا جاتا۔ گزشتہ اتوار انہوں نے لیموں اور مالٹوں کا رس نکال کر اس میں سرخ مرچیں اور نمک ڈال کر پیا۔ پھر غلیل وغیرہ کی مدد سے مارے ہوئے ہرپل بالکل ٹارزن کے سے انداز میں دو چھڑیوں میں اٹکا کر' نیچے آگ جلا کر پکائے گئے۔ یہ الگ بات ہے کہ انہیں آنچ بالکل نہ آئی۔ البتہ دھوئیں میں کالے سیاہ ہو گئے۔ جنہیں نمک مرچ لگا کر مزے سے کھایا گیا۔ اور خود کو ٹارزن سمجھ کر مست ہوتے رہے۔

وسیم نے کیک کے ٹکڑے کو ڈنل کی ایک جیب میں ٹھونسا اور دوسری میں مالٹے ٹھونس کر اپنے خاص انداز میں کھڑکی کے راستے کود کر سبزیوں میں سے ہوتا ہوا جانے ہی لگا تھا۔ کہ امی کی آواز آئی۔ وہ کسی سے کہہ رہی تھیں۔

"اوہ مسز جاوید۔ آپ! افوہ کتنی خوشی ہوئی مجھے۔ بس آج میں آپ کے ہاں جانے ہی والی تھی۔ اچھا ہوا آپ آ گئیں۔

پھر پچکار کر "اور ننھے گڈو۔ تمہارا کیا حال ہے" وہ گیٹ پر کھڑی کسی کا استقبال کر رہی تھیں۔

وہ ٹھٹک گیا۔ یہ کون آ گئیں۔ ظاہر ہے اب باہر کے گیٹ کا رخ کرنا خطرناک تھا۔ وہ زیر لب بڑبڑاتا واپس کمرے میں آ گیا۔ اور بستر پر بیٹھ کر میدان صاف ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ اتنے میں اندر آ گئیں۔

"وسیم) بیٹے۔ مسز جاوید آئی ہیں۔ ان کا ننھا بیٹا گڈو بھی ساتھ ہے۔ مگر وہ بڑا شرارتی لڑکا ہے۔ ایک پل بھی اپنی ماں کو آرام سے نہیں بیٹھنے دیتا۔ دو منٹ بیٹھ کر بات کرنا بھی دشوار ہے۔ تم ذرا اسے باہر گھما لاؤ"۔

"میں؟" وسیم نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں بیٹے۔ تو کیا ہرج ہے۔ اس وقت کوئی بھی فارغ نہیں۔ باورچن چائے بنا رہی ہے بشیر سودا لینے گیا ہے۔ تم ہی اسے لے کر باہر چلے جاتے تو اچھا تھا۔ پریم ساتھ ہے۔ اس میں بٹھا لینا ۔۔۔۔۔"

وسیم کے چہرے پر حیرت کے ساتھ ساتھ احتجاج بھی ابھر آیا۔ "مگر امی۔ میں کس طرح پریم میں ایک بچہ بہلا سکتا ہوں۔۔۔۔۔؟" اس نے گویا فریاد کی "وہ لوگ سمجھیں گے۔ میں اس کا نوکر ہوں۔۔۔۔۔"

"کوئی بات نہیں بیٹے" امی نے پچکارا "میں جانتی ہو تم چھٹی منانا چاہتے ہو۔ مگر اس طرح تمہاری بھی سیر ہو جائے گی۔ اور تمہیں سب جانتے ہیں کوئی نوکر نہیں سمجھے گا۔ بچہ بچارا بھی بہل جائے گا"۔

"ہونہہ بہل جائے گا۔۔۔۔۔" وسیم دانت پیس کر بڑبڑایا۔ اور آہستہ آہستہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"اچھا۔ آپ چلئے۔ میں ابھی آتا ہوں۔۔۔۔۔"

"شاباش" امی نے جاتے ہوئے کہا۔ "بڑے اچھے بیٹے ہو تم۔ میں ادھر برآمدے میں تمہارا انتظار کرتی ہوں۔۔۔۔۔"

وسیم آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا' منہ بنائے' باہر نکل آیا۔ امی برآمدے میں کھڑی تھیں۔ ساتھ ہی مسز جاوید بھی اپنی تمامتر مسکراہٹوں اور بچے سمیت موجود تھیں۔

"لو وسیم۔ یہ ہے ننھا گڈو۔۔۔۔۔ اسے ذرا باہر گھما لاؤ۔"

امی نے کہا "یہ بڑا پیارا بچہ ہے۔ تمہیں بالکل تنگ نہیں کرے گا۔" وسیم نے تیوری چڑھا کر اسے دیکھا۔

"ہاں بیٹے یہ تمہیں ذرا بھی تنگ نہیں کرے گا۔ مسز جاوید نے بھی رشوت کے طور پر ہنس کر کہا۔ اور بچے سمیت پریم اس کے حوالے کر دی۔

وسیم سر جھکائے' اسے بے دلی سے دھکیلتا گیٹ سے باہر نکل گیا۔ وہ دل ہی دل میں کڑھ رہا تھا۔ کیسا انہوں نے میری چھٹی کا ناس مارا ہے۔ بچے کو گھما لاؤ۔۔۔۔۔! ہونہہ۔۔۔۔۔ وہ سوچتا ہوا سیدھا اپنے ہیڈ کوارٹر کی طرف چل دیا۔ کھنڈر سے ذرا دور ے اس نے پریم روک دی۔ اور بچے کو گھورنے لگا۔ جو مزے سے بیٹھا انگوٹھا چوس رہا تھا۔ وسیم کو متوجہ نہ پا کر اس نے کچھ بولنا ضروری سمجھا۔

"بب۔ بب۔ تا۔ با۔ بب۔" وہ ہنس رہا تھا۔

"چپ" وسیم نے ڈانٹا۔ اسے اس وقت یہ گول مٹول بچہ زہر لگ رہا تھا۔ اسی کی وجہ سے

اس کی چھٹی غارت ہوئی۔ مگر بچے کو جیسے پروا ہی نہیں تھی۔ اس نے اسے مزید خوش کرنے کے لیے تکیہ اٹھا کر نیچے پھینک دیا۔ وسیم اسے اٹھانے جھکا۔ تو اس نے دوسرا تکیہ اس کے سر پر دے پھینکا۔ اور بے حد خوش ہو کر قلقاریاں مارنے لگا۔ وسیم کو سخت غصہ آیا۔ مگر وہ چپ رہا۔ پریم دھکیلنی بھی اب مشکل تھی۔ کیوں کہ آگے کھیت تھے۔ اس نے جیب میں سے اپنی لٹو والی رسی نکالی۔ اس کی مدد سے پریم کو ساتھ والے درخت سے باندھا۔ اور گڈو میاں کو گود میں لٹکا کر چل پڑا۔ بچہ برابر اس کے بال کھینچ رہا تھا۔ اور پاؤں کس کس کر پیٹ میں مار رہا تھا۔ کبھی اپنی انگلیاں اس کی آنکھوں میں گھساتا تو کبھی کان کی لو میں لینے کی کوشش کرتا۔۔۔۔۔

"کیا مصیبت ہے" وسیم ایک جھٹکے سے کان چھڑاتا ہوا بڑبڑایا "پتہ نہیں ایسے خبیث بچوں کو لوگ کیوں اتنا چومتے چاٹتے ہیں۔ ہونہہ"۔

آخر بڑی دقت سے وہ کھنڈر میں پہنچا۔ تو وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ وہ حیرت زدہ سا تھوڑی دیر کھڑا رہا۔ اتنے میں ہنستے کھلکھلاتے سب اپنی اپنی کمین گاہوں سے نکل آئے۔ تو اس نے اطمینان کا سانس لے کر بچے کو نیچے بٹھا دیا۔

"یہ کون ہے" سب اس کے گرد اکھٹے ہو گئے۔

"اسے چرا کر لایا ہوں" وسیم نے بڑی اہمیت سے کہا۔

"جیسے ڈاکو لے آتے ہیں نا۔ بس۔ اسی طرح اب ہم اس کے بدلے اس کے ماں باپ سے بہت سا روپیہ مانگیں گے۔ تب دیں گے۔ ورنہ نہیں۔۔۔۔۔"

یہ سکیم سن کر سب حیران رہ گئے۔ اور تحسین آمیز نگاہوں سے وسیم کو دیکھنے لگے۔ یقیناً وہ ان سب کا سردار بننے کے لائق تھا۔ کس غضب کی سکیم تھی۔

بچہ رینگتا رینگتا ہاشم کے پاس پہنچا اور منہ اٹھا کر اسے دیکھنے لگا۔ "دوا۔ با۔ با۔ ابا۔ با" وہ رال بھرے منہ سے کھلکھلایا۔ ہاشم کو شرم آ گئی۔ وہ جھینپی ہوئی سی ہنسی ہنس کر بولا۔

یہ مجھے اپنا ابا سمجھ رہا ہے۔۔۔۔۔"

"اچھا بتاؤ۔ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے" جواد نے کچھ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

"کتابوں میں تو یہ ایسا لکھا ہوتا" فرخ نے کہا" کہ ڈاکو بچے کے ماں باپ کو ایک چٹھی لکھ دیتے ہیں کہ اتنے پیسے دو اور بچہ لے جاؤ۔۔۔۔۔"

"بھئی ہم یہ نہیں کریں گے" وسیم جلدی سے بولا۔

"کیوں۔ کیوں نہیں کریں گے" ہاشم نے جرح کی۔ وہ سدا کا جھگی تھا۔

"اس لیے کہ ہمارے پاس کوئی کاغذ اور پنسل نہیں اس وقت" وسیم نے قدرے سوچ کر

کہا۔

"مگر ڈاکو لوگ تو پتوں پر بھی چٹھیاں لکھ لیتے تھے۔" فرخ نے اعتراض کیا۔

"اچھا؟" وسیم نے حقارت سے کہا۔ "تو تم پتوں پر بھی لکھ لو۔ کون منع کرتا ہے۔ جاؤ لکھو۔۔۔۔۔"

اتنے میں ہاشم نے ایک چیخ ماری۔ سب ادھر متوجہ ہو گئے۔ ہوا یوں تھا کہ میاں ہاشم نے بچے سے مزید دوستی کرنے کے خیال سے اس کے منہ میں انگلی ڈال دی تھی۔ جسے اس نے اپنے چار دانتوں کی مدد سے کاٹ کھایا۔ وہ انگلی سہلاتے ہوئے کراہ کر بولا۔

"ہڈی تک دانت گاڑ دیے۔۔۔۔۔ دیکھو تو سہی ذرا" وسیم پاس آ کر ہمدردی سے دیکھتے ہوئے انگلی سہلائی۔ "واقعی کٹ گئی ہے انگلی۔" اس نے افسوس سے سر ہلا کر کہا۔

"ایسا کٹکھنا بچہ تم لائے کیوں تھے بھلا" ہاشم اپنی زخمی انگلی کو دباتے ہوئے بولا۔

"مجھے کیا خبر تھی یہ ایسا نکلے گا" وسیم نے جواباً کہا۔ "قصور تو تمہارا اپنا ہے۔ نہ تم انگلی اس کے منہ میں دیتے نہ یہ کاٹتا۔ اب اس کو مت چھیڑے کوئی۔ اسے میں لایا ہوں۔ اور یہ مجھے نہیں کاٹتا۔۔۔۔۔"

"اچھا اب اس سے رقم کس طرح کمائیں" فرخ کی عادت بٹیوں جیسی تھیں۔

"ہم میں سے کوئی جا کر اس کے ماں باپ کو بتائے اور پیسے لے آئے۔۔۔۔۔"

"بس" جواد نے ترکیب بتائی۔

"مگر جائے کون؟" ہاشم انگلی سہلاتا ہوا بولا۔

"وسیم ہی اسے لایا تھا۔" فرخ نے کنکھیوں سے اسے دیکھ کر کہا۔

"ہاں تو میں نے اپنے حصے کا کام کر دیا ہے" وسیم نے جواب دیا۔

"لیکن ہم میں کوئی کس طرح رقم لا سکتا ہے" ہاشم نے جھلا کر کہا

"تم بچے کو لائے ہو۔ تمہیں اس کے گھر کا پتہ ہو گا۔ ہمیں تو نہیں! اب ہم یہ تو نہیں کر سکتے کہ گھر گھر سے اسے لیے پھریں کہ بھئی کس کا بچہ ہے تم ہی جا سکتے ہو۔

"ہاں جا تو میں ہی سکتا ہوں۔ مگر میں جاؤں گا نہیں۔ بالکل نہیں جاؤں گا۔ اور اگر کوئی کہے گا کہ میں جاؤ" تو اس سے لڑوں گا۔ وسیم کے تیور خطرناک تھے۔ سب خاموش ہو گئے۔ آپس میں لڑنا ان کے مسلک کے خلاف تھا۔ لہٰذا موضوع بدل دیا گیا۔

"اچھا بھئی آج ہم لوگ سیاں پکنک منانے کے لیے کیا کچھ لائے ہیں" جواد نے پوچھا۔ اس پر وسیم نے اپنے حصے کا کیک اور دونوں تھیلے نکال کر رکھ دیے۔ فرخ دو بسکٹ اور شربت کی

آدھی بوتل لایا تھا۔ جوداننے بھی دو انڈے اور آدھی ڈبل روٹی نکال کر رکھ دی۔ ہاشم ایک مٹی کے تیل کی بوتل' ایک ماچس اور ایک سیب لایا تھا۔

"میں نے سوچا گیلی لکڑیاں اس طرح نہیں جلیں گی" ہاشم نے اپنی دور اندیشی کی داد پانے کے لیے کہا۔ "اس لیے مٹی کے تیل کی بوتل لے آیا"۔

"بہت اچھا کیا تم نے" جواد بولا "مگر پکانے کے لیے آج کچھ ہے ہی نہیں ہمارے پاس ——" وہ اداس ہو گئے

"چلو یہ چیزیں یہیں چھوڑ دیں اور باہر نکل کر شکار ڈھونڈیں" وسیم نے مستعدی سے کہا۔ "کچھ نہ کچھ تو مل ہی جائے گا۔"

اس تجویز پر سب نے اتفاق کیا۔ اور اپنا مال غنیمت وہیں ایک کونے میں ڈال کر یہ لوگ مختلف سمتوں میں بکھر گئے۔ بچہ مزے سے وہیں کھیلتا رہا۔ جاتی دفعہ وسیم نے احتیاطاً دروازہ بند کر دیا تھا۔ اس لیے بچے کے باہر نکلنے کا کوئی خطرہ نہ تھا۔

کوئی پون گھنٹہ بعد وسیم اور جواد واپس پہنچے۔

"کیوں کچھ ملا؟" جواد نے پوچھا۔

"کچھ نہیں" وسیم نے اداس ہو کر بتایا "شاید وہ لوگ کچھ مار لائیں۔ اور دونوں دروازہ کھول کر اندر چلے گئے۔

گڈو میاں اندر مزے اڑا رہے تھے۔ رینگتے رینگتے وہ مال غنیمت تک پہنچ کر اس کا کباڑا کر چکے تھے۔ نتیجتہ" اس کے سارے بالوں میں مٹی کا تیل لگا تھا۔ منہ ہاتھ پاؤں' اور فراک بھی اس کی زد سے باہر نہ رہ سکے غرض گڈو صاحب سارے کے سارے تیل میں لت پت ہو رہے تھے۔ علاوہ ازیں ٹوٹے ہوئے انڈوں کی زردی' کیک اور بسکٹوں کے چورے میں مل کر ارد گرد بکھری پڑی تھی۔ کچھ ان کے منہ پر بھی لگی تھی۔ اور ہاتھ میں کچلے مسلے مالٹے پکڑے وہ کھلکھلا رہے تھے۔

دونوں بانی کچھ دیر دم بخود کھڑے اس روح فرسا نظارے کو دیکھتے رہے۔

"اب بتاؤ آگ کیسے جلے گی" آخر جواد نے گھبرا کر کہا۔

"ہاں۔" وسیم منہ ہی منہ میں بڑبڑایا "اور اسے اس حالت میں گھر کون لے جائے گا؟"

"مگر یہ سارا قصور اس کا اپنا ہے" جواد نے غصے سے کہا۔ "کوئی ہم نے تو اسے نہیں کہا تھا۔ لے کے ساری چیزیں برباد کر دیں"۔

"ٹھیک ہے مگر یہ بات مانے گا کون" وسیم نے سر ہلا کر کہا۔

"لاؤ اس کا منہ ہی دھلا دیں"۔

"مگر کس کے ساتھ؟" جواد نے تیوری چڑھائی "پانی تو ہے ہی نہیں

اس پر وسیم نے آہستہ سے اپنا میلا سا رومال جیب سے نکالا اور بچے کی طرف بڑھا۔ اچانک اسے کونے میں لگی ہوئی شربت کی آدھی بوتل نظر آئی۔ اتفاقاً حالیہ حملے میں یہ بچی رہ گئی تھی۔ اس نے کارک کھول کر پتلے پتلے شربت میں رومال بھگویا اور بچے کے منہ پر پھیرنے لگا۔

"اس سے کیوں دھوتے ہو" جواد نے احتجاج کیا "یہ تو شربت ہے" مگر ہے تو پانی کا بنا ہوا۔ وسیم نے برجستہ کہا۔

"پھر ہم پئیں گے کیا؟" جواد نے فریاد کی "کچھ بھی تو نہیں بچا۔ اس تمہارے بچے نے سارا کچھ تباہ کر دیا۔ یہ ایک شربت کی بوتل تھی۔ اس سے تم اس کا منہ دھلا رہے ہو——"

ادھر وسیم کو ایک نئی مصیبت چمٹ گئی۔ شربت میں بھیگا ہوا رومال گڈو کا منہ نزدیک ہی ہے۔ چنانچہ اب ان کی غفلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے گڈو میاں نے رومال کا ایک کونہ دانتوں میں مضبوطی سے پکڑ لیا تھا—— اور اسے چھوڑنے کو تیار نہیں تھے۔ اسی دھینگا مشتی کے دوران دروازہ کھلا اور بقیہ دونوں سورما بھی اندر آ گئے۔ ان کے ہمراہ ایک گائے بھی تھی۔

"ہم گائے لائے ہیں جناب" فرخ نے فاتحانہ انداز میں کہا۔ اپنے جوش و خروش میں وہ کمرے کی اندرونی خستہ حالت کو دیکھ ہی نہ سکے۔

"یہ جیرے کی ہے۔ وہ جس کا کھیت سڑک کے پار ہے۔ ہم اسے اپنے ساتھ لے آئے ہیں" "مگر اسے ہم کیا کریں گے۔" وسیم نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"کیا کریں گے؟" ہاشم ہنسا "تم نے پڑھا نہیں کاؤ بوائے ہمیشہ لوگوں کی گائیں چرا کر لے آتے ہیں"۔

"مگر کیا کریں گے کیا اسے" وسیم اب بھی اس کی افادیت جاننے پر مصر تھا۔

"اسے ذبح کر کے پکائیں گے۔ اور کیا" جواد نے ہچکچاتے ہوئے بتایا۔

"واہ اور خود پھانسی پر لٹک جائیں گے۔ ہونہہ" وسیم نے حقارت سے کہا۔ "پتہ بھی ہے گائے کو مارنا گناہ ہے۔ بس صرف قصائی ہی اسے ذبح کر سکتے ہیں۔ دوسرے لوگ کریں تو انہیں پھانسی دے دی جاتی ہے۔ بس اس طرح جیسے انسانوں کو قتل کرنے سے سزا ملتی ہے۔"

ادھر گائے مزے سے شربتی ہوئی بچے کے پاس چلی گئی۔ اور نتھنے پھلا پھلا کر سونگھنے لگی۔ گڈو میاں کی مسرت سے باچھیں کھل گئیں وہ ہمک ہمک کر اسے پکڑنے کی کوشش کرنے لگے۔

"اچھا آؤ۔ پکنک ہی منا لیں" ہاشم نے قدرے خفیف ہو کر کہا۔ اس کا سارا کارنامہ بے کار

گیا تھا۔

"پٹنگ" جواد نے سرد آہ بھری۔۔۔۔۔ "کیسے منائیں اب یہ بچے صاحب سارا کچھ غارت کر کے بیٹھے ہیں۔ دیکھ لو نہ تیل ہے۔ نہ مالٹے نہ کیک۔ وسیم نے شربت کی بوتل سے اس کا منہ دھلا دیا۔۔۔۔۔"

فرخ اور ہاشم بے چارے سکتے میں رہ گئے۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا سر جھکائے وہ لکڑیاں جمع کرنے باہر نکل گئے۔ تاکہ ایک آدھ آلو بھون لیں جو دو روز پہلے جواد لایا تھا۔

"وسیم۔ ہماری گائے کہیں تمہارے بچے کو نہ مارے۔" اچانک ہاشم نے تشویش سے کہا۔ اس پر وسیم کے کان کھڑے ہوئے اور اس نے واپس آ کر دروازے میں سے جھانکا۔

گائے اور گڈو میاں ابھی تک نہایت دوستانہ انداز سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔۔ البتہ گائے آہستہ آہستہ کچھ کھا بھی رہی تھی۔ یہ ننھے کا ہیٹ تھا۔ جو ریشمی ڈوریوں سے بندھا اس کے گلے میں پڑا تھا۔ پیم چوسنے سے ڈوریاں کھل گئی تھیں گڈو میاں ایک ہاتھ میں مٹی کے تیل سے تر بتر بسکٹ لیے گائے کی طرف بڑھا رہے تھے۔ جسے گائے ناک چڑھا کر سونگھ رہی تھی۔ وسیم کی مداخلت پر دونوں نے اسے دیکھا۔ مگر گھومنے میں گائے کی دم زور سے بچے کے منہ پر لگی۔ اس پر جو اس نعرہ بلند کیا تو سب بھاگے آئے۔

"کیا ہوا" انہوں نے ہانپتے ہوئے پوچھا۔

"فرخ سے پوچھو۔ اسی کی گائے ہے۔" وسیم نے حقارت سے کہا۔ "لیکن اپنی دم اس کے منہ مار دی"۔

اب سب کے سب بچے کو چپ کرانے میں جٹ گئے مگر وہ کسی طرح چپ ہی نہ ہوتا تھا۔

"تم ہی اسے لائے تھے" جواد نے چیخ کر وسیم سے کہا کیونکہ بچے کی دھاڑنے کی وجہ سے کچھ سنائی دینا مشکل تھا "اب چپ بھی اسے تم ہی کراؤ۔۔۔۔۔"

"میرا خیال ہے اسے بھوک لگی ہے" ہاشم نے کہا۔ بچہ مسلسل روئے جا رہا تھا۔ وسیم نے ادھر ادھر دیکھ کر ایک کیک کا ٹکڑا اٹھایا اور اسے گڈو میاں کے سامنے لہرانے لگے جو اسے دیکھ کر فوراً چپ ہو گئے اور ہاتھ بڑھا دیا۔ اب وہ مزے لے لے کر کیک نگل رہے تھے اور پھر مسکرانے لگے تھے۔

مطمئن ہو کر سب باغی باہر نکل کر پھر سے آگ جلانے کی فکر کرنے لگے ادھر گائے بھی ٹہلتی ٹہلتی باہر آ گئی اور ان سب میں تھوتھنی گھسا کر آگ جلنے کا تماشا دیکھنے لگی بڑی مشکل سے اسے ہٹایا گیا تو پھر آ گئی۔

"بھئی کیا مصیبت ہے" وسیم نے جھلا کر کہا "فرخ تم اپنی گائے کیوں نہیں سنبھالتے؟"

ادھر گائے تھی کہ ہزار شی شی کرنے پر بھی نہیں ہٹتی تھی جواد صاحب نے آگے بڑھ کر ذرا دھکیلا تو اس کی دم زناٹے سے منہ پر آ کر لگی وہ چہرہ سہلاتے پیچھے ہٹ آئے اب وسیم نے بہادری دکھانی چاہی تو گائے نے سر جھکا کر مارنے کی دھمکی دی ناچار ہار ماننی پڑی اب سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ اسے چھڑیوں سے ہنکایا جائے چنانچہ بڑی مشکل سے مار مار کر اسے بھگایا گیا۔

اب پھر سب آلوؤں کی طرف متوجہ ہوئے جو کہیں سے جل گئے تھے اور کہیں سے کچے تھے مگر انہیں خوب مزے لے لے کر کھایا گیا گڈو میاں بھی اب رینگتے رینگتے کھلے دروازے میں سے باہر آ گئے تھے تھوڑی دیر بعد جانے کی ٹھہری مگر وسیم نے گڈو کو دیکھا تو جھرجھری آ گئی مٹی کے تیل اور کچے انڈوں کی مہک میں لپے ہوئے اس بچے کی گود میں اٹھا کر پریم تک لے جانا حقیقتاً بڑے دل گردے کا کام تھا۔

"بھئی کچھ میری مدد کرو" وسیم نے فریاد کی "کم سے کم اس کے بالوں میں پھنسے ہوئے کیک کے ٹکڑے ہی نکال دو۔"

چنانچہ سب بچے پر پل پڑے۔۔۔۔۔ تھوڑی دیر میں اس کے بال صاف ہو گئے تو وسیم نے قدرے مطمئن ہو کر اسے گود میں لٹکایا اور ساتھیوں کو وداع کہہ کر پریم کی طرف چل دیا۔ مگر وہاں پہنچ کر اسکا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا کیونکہ پریم موجود نہ تھی اس نے بوکھلا کر ادھر ادھر دیکھا تو دور چند بچے ایک پریم نما چیز میں بیٹھے نظر آئے۔

"یہ میری پریم ہے" "وہ چلایا۔ یہ مجھے دو"۔

بچے جنہوں نے پچھلے دو گھنٹے اس مزے دار سواری پر سیر کرنے میں گزارے تھے بھلا کیوں اتنی جلدی دستبردار ہوتے۔

"یہ ہماری ہے" وہ چلائے "ہم نے اسے یہاں سے ڈھونڈا ہے"۔

"میں ہی اسے یہاں باندھ کر گیا تھا" وسیم دھاڑا۔ "ٹھہرو تم نہیں دیتے تو میں ابھی تمہیں ٹھیک کرتا ہوں" یہ کہہ کر اس نے بچے کو ایک طرف بٹھایا اور آستین چڑھاتا ان کی طرف لپکا۔

پریم کو ہتھیانے والے بچے سبھی اس سے چھوٹے تھے لہٰذا انہوں نے خیریت اسی میں دیکھی کہ مقبوضہ چیز سے دستبردار ہو جائیں۔

"لو لے لو اپنی گندی سی پریم" وہ اچھل کر باہر نکل گئے۔ وسیم نے اطمینان کا سانس لے کر پریم میں بچے کو بٹھایا اس کا ہڈ ٹیڑھا ہو چکا تھا اسے کھینچ کھانچ کر سیدھا کیا تکیہ اپنی جگہ پر رکھا وہ

سرا کہیں گم ہو چکا تھا وسیم پریم کو دھکیلتا ہوا گھر لے آیا۔
گیٹ پر ہی مسز جاوید کھڑی تھیں۔ اپنی باریک آواز میں چلائیں لاؤ گڈو کو مجھے دو۔۔۔۔۔۔
شاباش تم بہت پیارے بچے ہو۔ خوب اسے سیر کرائی بہت بہت شکریہ۔"
مگر یہ سارا کچھ انہوں نے بچے کو دیکھنے سے پہلے کہا تھا۔۔۔۔!

11

باجی نجمہ کی شادی تھی یہ وسیم اور بینا وغیرہ کی چچا زاد بہن تھیں شادی انہی کے شہر میں ہو رہی تھی لہٰذا دوسری جگہوں سے کچھ مہمان آکر مسز کلیم کے ہاں ٹھہر گئے خوب رونق تھی۔ مہمانوں میں ایک لڑکا رضوان وسیم میاں کا ہم عمر تھا چنانچہ دونوں میں فوراً دوستی ہو گئی ہر شرارت میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے۔

گھر بھر میں شادی کی تیاریاں زور شور سے جاری تھیں۔ خوب بچوں اور بڑوں کے جوڑے سل رہے تھے۔ زیور تیار ہو رہے تھے نئی ٹائیاں موزے اور جوتے خریدے جا رہے تھے۔ غرض ایک ہنگامہ تھا وسیم میاں کی بھی سفید رنگ کی شیروانی سلوائی گئی تھی۔ سفید ہی پاجامہ تھا۔ ادھر رضوان بہادر کا ہلکے رنگ کا عمدہ سوٹ تھا۔ اس کے بھائی ریحان کی بھی چھوٹی سی شیروانی بنوائی گئی۔

اب جہاں تک وسیم میاں کا تعلق تھا۔ وہ شادی پر جانے کو تیار تھے مگر بارات کے ہمراہ جانے کو ہرگز تیار نہ تھے۔ نعیم بھیا آپا روبینہ رضوان غرض سب لوگ بارات کے ہمراہ سدھیانے جا رہے تھے مگر وسیم میاں مچل گئے کہ نہیں جاؤں گا اس لیے کہ اتفاقاً اسی دن اتوار تھا جس کا خاص پروگرام باغیوں نے بنا رکھا تھا اور یہ قطعی ممکن نہ تھا کہ وہ اپنے اتنے شان دار پروگرام کو محض بارات جیسی چھچھوری چیز پر قربان کر دیتا۔

آخر بڑی بحث و تمحیص کے بعد اسے رضامند کر لیا گیا۔ ادھر امی نے خفیہ طور پر جواد ہاشم اور فرخ کی قابل احترام ماؤں کو کہلا بھیجا کہ اتوار کے دن اپنے فرزندان ارجمند کو ادھر آنے سے باز رکھیں۔ یہ سارا انتظام کر کے بزرگ مطمئن ہو گئے۔

آج جمعہ تھا کسی چھوٹے موٹے تہوار کی وجہ سے سکول بند تھا لہٰذا وسیم کے یار ان غار سب جمع تھے۔ اور لان میں ایک نیا کھیل کھیلا جا رہا تھا یعنی کوہ پیمائی۔۔۔۔۔ اس میں انہوں نے کہیں سے ایک لمبا چوڑا تختہ لا کر باغ کی چار دیواری کے ساتھ کھڑا کر دیا تھا اور اس پر لوہے کی ایک نوک دار چھڑی کے سہارے بالکل کوہ پیماؤں کے سے انداز میں چڑھتے اترتے یہ چڑھتے اترتے یہ چھڑی وسیم کے ابا کو ان کے کسی دوست نے تحفہ دی تھی تاکہ مری وغیرہ جانے میں ان کے کام آئے لیکن وسیم میاں نے ہتھیالی اور اب مزے سے اودھم مچائے پھر رہے تھے۔ اس تختے پر سے کئی دفعہ پھسلے گرے چوٹیں لگیں مگر وہ بات سے بے نیاز کھیلتے رہے۔

آخر اتوار بھی آ ہی گیا۔ وسیم کا دل کسی طرح بارات میں شامل ہونے کو نہیں چاہتا تھا ادھر رضوان بھی اسی کا ہم خیال ہو چکا تھا۔ لیکن ہزار بہانوں کے باوجود کہ "سر میں درد ہے" ——— "پیٹ میں ٹیسیں اٹھ رہی ہیں" ——— ٹانگ کا پٹھا کھنچ گیا ہے چل نہیں سکتا۔"

آخر اسے اٹھنا ہی پڑا اور پھر باول نخواستہ دونوں کو کپڑے بدلنے بھیج دیا گیا ادھر بینا نے ننھے ریحان کو بنا سنوار کر تیار کر دیا۔ سفید ساٹن کے تنگ پاجامے پر سفید ہی چمک دار شیروانی پہنے وہ بڑا پیارا لگ رہا تھا۔ بوٹ وغیرہ پہنا کر بینا نے اسے چمکارا کہ کپڑے گندے مت کرنا اور خود نہانے چلی گئی۔

تین سالہ ریحان ٹہلتا ٹہلتا ڈائننگ ٹیبل کی طرف چلا گیا۔ یہاں اس وقت کوئی نہ تھا۔ سب اپنی اپنی جگہ شادی میں جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ البتہ میز پر مکھن کی دو بڑی بڑی ٹکیاں اور کچھ سنترے پڑے تھے۔ یہ اس نے قابو میں کیے اور ڈرائنگ روم میں جا کر دیوان پر بیٹھ کے کھانے شروع کیے۔ مکھن کچھ کھایا کچھ منہ اور بالوں پر لیپ لیا۔ بقیہ کپڑوں پر لگ گیا۔ اب سنتروں کی باری آئی۔ نرم اور بہت زیادہ پکے ہوئے سنترے ہاتھ لگاتے ہی پھیل پڑے۔ وہ ٹپکتی ہوئی پھانکوں کے پیچھے منہ میں ٹھونس ٹھونس کر کھانے لگا۔ اب حالت یہ تھی کہ سارا رس ہاتھوں پر سے ہوتا ہوا کہنیوں تک جا رہا تھا۔ پھر وہاں سے نیچے ٹپک رہا تھا۔ ادھر ہونٹوں کے آس پاس کا سارا علاقہ رس میں تر بتر تھا۔ اور ننھے میاں دنیا و مافیہا سے بے خبر سنتروں کے رس کے تالاب میں بیٹھے کام و دہن کی تواضع میں مصروف تھے۔

اتنے میں رضوان اور وسیم منہ تھتھائے' اپنی ہر ہر حرکت سے احتجاج ظاہر کرتے ڈرائنگ روم میں آئے۔ انہیں سختی سے فہمائش کی گئی تھی کہ آرام سے صوفوں پر بیٹھیں۔ ادھر ادھر نہ بھاگیں دوڑیں تاکہ لباس پر شکن نہ پڑے۔

کمرے میں آتے ہی یہ نظارہ جو انہوں نے دیکھا تو کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔

"ہائے منا بے چارا۔ اب شادی میں کیسے جائے گا۔" رضوان نے افسوس سے سر ہلایا وہ اپنے شان دار بادامی سوٹ میں بے حد سمارٹ نظر آ رہا تھا۔ وسیم کھڑا کچھ سوچنے لگا۔

"کھاؤ گے؟" ننھے ریحان نے موٹی گدبری انگلیوں میں بھنچا ہوا ٹپکتا ٹپکتا سنترہ اسے پیش کیا۔ تو اس نے بڑے وقار سے سر ہلا دیا۔ ریحان اب رس دار گیلے دیوان پر سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا تھا۔ وسیم کچھ دیر سوچ میں ڈوبا رہا۔ پھر بڑی مظلوم نظروں سے رضوان کو دیکھ کر بولا ———— "دیکھو۔ یہ تو اس طرح برات میں جانے سے بچ گیا۔ ایک ہم ہی نہیں بچ سکے"۔

"کیوں نہیں بچ سکے ———"

"کیوں نہیں بچ سکتے" اس نے دیوان کی طرف دیکھ کر کہا۔ "اگر ....." رضوان کا جملہ پورا ہونے سے پہلے گیلری میں باتیں کرنے کی آواز آئی۔ شاید سب گھر والے کپڑے وغیرہ پہن کر تیار ہو چکے تھے۔ اور اب ادھر آ رہے تھے۔ رضوان نے جلدی سے وسیم کا ہاتھ پکڑا اور دیوان کی طرف لپکا۔

"آؤ اس پر جلدی سے بیٹھ جاؤ ———" اور دونوں اس گیلے چپچپے دیوان پر آرام سے بیٹھ گئے۔

تھوڑی دیر بعد بینا آپا اور ابا جان داخل ہوئے۔ ساتھ ہی چچی اماں بھی تھیں۔

"ماشاء اللہ دونوں کتنے پیارے لگ رہے ہیں" چچی اماں نے پر تحسین نظروں سے رضوان اور وسیم کو دیکھ کر کہا۔ "ذرا دونوں ادھر آؤ۔"

وہ نظر بد دور کرنے کے لیے دعا پڑھ کر ان پر پھونکنا چاہتیں تھیں' دونوں ہچکچاتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور نہایت سنجیدگی سے پاس آ گئے۔ اس صورت میں کہ دونوں کی پشت ابا جان کی طرف ہو گئی۔

"ارے ——— یہ کیا کیا تم نے؟" وہ گھبرا کر بولے۔

"جی؟" دونوں ان کی طرف گھومے تو پشت کا نظارہ چچی اماں اور بینا کو بھی دکھائی دے گیا۔ بینا کی تو چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ دانت پیس کر وہ پاس آئی۔ اور دبے لہجے میں بولی۔

"یہ کیا کیا تم نے کم بختو ———"

"ہمیں پتہ نہیں تھا۔ کہ دیوان گیلا ہے" وسیم نے مشینی انداز سے کہا۔ "ہم اوپر بیٹھ گئے اور ....."

"اور کیا۔ ہمیں بالکل پتہ نہیں تھا" رضوان نے زور دے کر کہا۔

"نہیں تو ہم کیوں بیٹھتے اس کے اوپر ———"

"تمہیں نظر نہیں آیا کہ سارے دیوان پر ....." بینا کا جملہ ادھورہ رہ جانے کی وجہ سے ننھے ریحان کا داخلہ تھا۔ اس کا حلیہ دیکھ کر سب سکتے کے عالم میں رہ گئے۔ بینا کا تو نروس بریک ڈاؤن ہوتے ہوتے بچا۔ اس کی ساری محنت اکارت چلی گئی تھی ——— آخر کوئی ایک گھنٹے کے بعد گھر کی موٹریں شادی والے گھر کی طرف روانہ ہوئیں تو ان میں وسیم اور رضوان نہ تھے۔

البتہ ننھے ریحان کو معمولی سا لباس پہنا کر ساتھ لے جایا گیا تھا۔ جاتی دفعہ ابا جان یہ دھمکی دے گئے تھے۔ کہ آ کر تم دونوں کو ٹھیک کروں گا۔ مگر دونوں کے ذہن سے نہ صرف یہ دھمکی

محو ہو چکی تھی۔ بلکہ آنے والے بھیانک لمحات کا ڈر دل سے پوری طرح نکال کر وہ اپنے من پسند کھیل کود پیائی میں مصروف ہو گئے تھے۔ البتہ انہیں یہ افسوس ضرور تھا کہ ان کے پیارے دوستوں کو یہاں آنے سے منع کر دیا گیا تھا۔ اور وہ دونوں اکیلے کھیلنے پر مجبور تھے۔ تاہم وہ بے انتہا خوش تھے۔ اس لیے کہ پورے گھر میں ان کی حکومت تھی۔ گھر والے اور نوکر وغیرہ سبھی شادی پر جا چکے تھے ..... انہوں نے کوہ پیائی کے کھیل کو زیادہ دل کش بنانے کی خاطر گھر بھر کے بستروں میں سے گدے اور تکیے نکال لیے تھے اور سیڑھیوں پر بچھا کر اسی نوک دار چھڑی کے سہارے ان پر چڑھ اتر رہے تھے۔ اس دوران اگر کبھی گر جاتے تو چوٹ سے بچانے کے لیے نیچے تکیوں اور کشنوں کا انبار تھا۔ جس پر دھم سے گرتے تو ایسا لگتا گویا پروں کے انبار میں گر پڑے ہوں وہ مسرت سے بھرپور فلک شگاف قہقہے لگاتے اور پھر سے چڑھائی شروع کر دیتے۔

"یار بارات میں جانے کا مزا تو نہ آتا" رضوان نے کھلکھلاتے ہوئے قلابازی لگائی۔

"اور کیا ----- وسیم نے تکیوں کے انبار پر جان بوجھ کر گرتے ہوئے کہا۔

"سارا دن کپڑوں کا خیال رکھنا پڑتا۔ یوں نہ بیٹھو۔ یہ نہ کرو۔ وہ نہ کھاؤ ---- ہونہہ"

اور گھر والوں کے آنے تک یہ کھیل اپنی پوری حشر سامانیوں کے ساتھ جاری رہا۔

12

عید سے ایک روز پہلے وسیم میاں اپنی محبوب بیکری پر گئے جو عثمان کی ملکیت تھی۔ اور عثمان اس کا بڑا گہرا دوست تھا۔ اپنے سب راز اس نے وسیم میاں کو بتا رکھے تھے۔ حتیٰ کہ سسرال والوں کے متعلق بھی بتا دیا تھا۔ کہ وہ لوگ ایسے ڈھیٹ ہیں کہ باوجود بے شمار روپیہ پیسہ اور تحائف وغیرہ لینے کے ابھی تک شادی پر تیار نہیں ہوئے۔ ادھر عثمان بہاؤ تھے کہ شادی پر ادھار کھائے بیٹھے تھے۔ بس یوں سمجھو گھڑیاں گن رہے تھے' آج بھی جب وسیم اس کے پاس پہنچا تو وہ منہ لٹکائے اداس بیٹھا تھا۔ وسیم نے غائر نظروں سے مرتبان کا جائزہ لیا۔

" یہ گلابی گولیاں تم نے نئی منگائی ہیں نا؟" اس ایک نے نئے مرتبان کی طرف اشارہ کیا۔ اسے دوکان کی ہر شے حفظ تھی۔

"ہاں میاں یہ نئی ہیں۔ کل ہی بازار سے لایا ہوں" وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولا مگر وسیم نے کوئی توجہ نہ دی۔ اسے اس کے عائلی مسائل سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

"اچھا تو پھر چار آنے کی دے دو ------ پیسے کل دے دوں گا وعدہ رہا" وسیم نے کہا۔

"نہیں میاں۔ ادھار نہیں چلے گا" عثمان نے سر ہلایا۔

"مگر کل عید ہے۔ اور مجھے عیدی' ضرور ملے گی" وسیم نے زور دے کر کہا۔

عثمان نے کچھ گولیاں نکال کر اسے پکڑا دیں' اور بدستور غمگین بیٹھا رہا۔ وسیم منہ میں گولیاں ڈالے دوسرے روز پیسے ادا کرنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔

اگلے روز عید تھی۔ اور وسیم کو امی کی نصیحت یاد تھی کہ عید کے روز سب سے نہایت خوش اخلاقی سے پیش آنا چاہیے۔ چھوٹوں سے محبت اور بڑوں کی تعظیم کرنی چاہیے۔ اور ہر کہ ومہ سے نہایت ملائمت والا برتاؤ کرنا چاہیے۔

چنانچہ بستر سے اٹھتے ہی اس نے تکیے کو مخاطب کر کے کہا۔ "میں آج خوش اخلاق بنوں گا۔ مگر صرف آج ------"

پھر اس نے غسل خانے کا رخ کیا۔ عرصے کے بعد برش اور ٹوتھ پیسٹ کے استعمال کی نوبت آئی۔ دانت چمکا کر اس نے صابن سے منہ ہاتھ دھویا۔ بلکہ پاؤں بھی خوب رگڑ رگڑ کر صاف کیے۔ امی نے رات ہی کو اس کے کپڑے استری کر کے ہینگر میں لٹکا دیے تھے۔ نئی جرابیں

اور نئے بوٹ ڈالے۔ بالوں کو بہت سا ایونگ ان پیرس تیل چپڑا اور کنگھی کر کے باہر نکلا تو کاریڈار میں ہی ابا ملے۔

"ابا جان سلام لیکم ـــــــــ" وہ ہنس کر بولا" اور عید مبارک"۔

"وعلیکم السلام بیٹے" انہوں نے قدرے مشکوک نظروں سے اسے دیکھ کر جواب دیا۔ "عید مبارک ہو۔ کیا بات ہے آج بہت چمک رہے ہو ـــــــــ"

"اس لیے ابا جان کہ آج عید ہے۔ اور امی جان نے کہا تھا آج کے دن کسی سے لڑنا جھگڑنا نہیں چاہئے اور خوش اخلاقی دکھانی چاہیے۔

"اچھا اچھا تو تم خوش خلق بنے ہوئے ہو۔ خوب۔ خدا راس لائے۔" یہ کہہ کر وہ تولیہ کندھے پر ڈالے باتھ روم میں گھس گئے۔

ناشتے کی میز پر سویاں کھانے کے دوران وہ خوب ہنستا رہا۔ سب کو عید مبارک کہا۔ حتیٰ کہ باورچن اور ڈرائیور کو بھی۔

"کیا بات ہے۔ طبیعت تو تمہاری ٹھیک ہے وسیم" ـــــــ نعیم نے تشویشناک لہجے میں پوچھا۔ "وسیم نے جوش سے کہا" آج عید ہے نا۔ اس لیے امی کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔

"بھئی اگر وہ خوش خلق بن گیا ہے تو اچھی ہی بات ہے۔ تم لوگ اتنی نکتہ چینی کر رہے ہو ـــــــ"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر....." نعیم نے سر کھجایا "ذرا ہمیں اس کی عادت نہیں نا ـــــــ"

"اس پر بیتا ہنس پڑی تو وسیم نے قہر آلود نظروں سے اسے گھورا۔ مگر ساتھ ہی اسے اپنا عہد یاد آ گیا۔ اس نے فوراً ہی چہرے پر مسکراہٹ طاری کر لی اور آہستہ سے بولا "معاف کرنا آپا ـــــــ"

ناشتے کے بعد وہ ابا اور بھائی جان کے ساتھ نماز پڑھنے چلا گیا۔ وہاں بھی نہایت تمیزداری دکھائی۔ واپسی پر اس نے شیروانی اور ٹوپی اتار کر گھر رکھی اور عثمان بیکری چل دیا۔

عثمان دروازے پر کھڑا کسی کی راہ دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظر بار بار اپنی بیس روپے والی دستی گھڑی پر جا رہی تھی۔ وسیم کو دیکھ کر بھی اس کے انداز میں فرق نہ آیا۔

"عید مبارک عثمان" وسیم نے نہایت خوش اخلاقی سے کہا۔ "اور یہ رہے تمہارے کل کے پیسے۔ آج کوئی نئی مٹھائی بنائی ہے کہ نہیں ـــــــ" وہ آگے بڑھ کر مرتبانوں کا جائزہ لینے لگا۔

"وہ کم بخت ابھی تک نہیں آیا۔" عثمان کوئی پچاسویں بار گھڑی دیکھ کر بڑبڑایا۔ "اور گاڑی نکل جائے گی۔"

"کون سی گاڑی۔" وسیم کو متوجہ ہونا پڑا۔

"یار میں نے آج سسرال جانا تھا۔ انہوں نے رات ہی پیغام بھیج دیا تھا۔ شاید وہ نکاح کرنا چاہتے ہیں۔ ادھر وہ بد ذات حمیدا ہے کہ ابھی تک نہیں آیا۔ دوکان کس پر چھوڑ کر جاؤں ـــــــ گاڑی نہ نکل جائے وہ سخت مضطرب تھا ـــــــ

وسیم کھڑا ہو کر مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے لگا۔ اچانک عثمان کو ایک تدبیر سوجھی۔

"دیکھو میاں وسیم۔ اگر تم پانچ منٹ میری دوکان کا خیال رکھو۔ تو میں چلا جاؤں؟ مجھے ڈر ہے کہیں گاڑی نہ نکل جائے۔ نو پچیس پر چھوٹتی ہے۔ اتنے میں وہ حمیدا آ جائے گا۔ میں نے اسے صبح ہی کہلوا دیا تھا۔ آدمی بھیجا ہے۔ بس وہ آتا ہی ہو گا۔ تمہیں پانچ منٹ کی تکلیف ہو گی ـــــــ ہیں ـــــــ اور میاں اس کے بدلے وہ ٹافیوں کا آدھا مرتبان تمہارا ـــــــ

وسیم حیرت زدہ رہ گیا۔ کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ نہ صرف دکان خواہ چند منٹ کے لیے ہی سہی۔ اس کی اپنی بن جائے۔ اوپر سے ٹافیوں کا آدھا مرتبان ..... اس نے نظر بچا کر خود کو چٹکی بھری۔ جب یقین ہو گیا کہ وہ خواب نہیں دیکھ رہا۔ تو اس نے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ تم جاؤ"۔

اور عثمان اس کی کمر تھپتھپا کر دکان سے نکل گیا۔

اس کے جانے پر وسیم چند منٹ یونہی بت بنا کھڑا رہا۔ پھر آہستہ سے پلٹا اور دکان میں گھوم پھر کر چیزیں دیکھنے لگا۔ چار پانچ بار ادھر سے ادھر گھومنے پر جب اسے یقین ہو گیا کہ دکان فی الحال اسی کی ملکیت ہے تو اس نے اپنی من پسند ملک ٹافیوں کا مرتبان کھولا اور اس میں سے مٹھی بھر کر ٹافیاں نکال لیں۔ مزے سے انہیں چوستا ہوا وہ آگے بڑھا تو ایک نئی سی چیز نظر آئی۔ یہ سفید رنگ کی ایرانی ٹافیاں تھیں۔ بالکل مکھن کی طرح ملائم۔ منہ میں ڈالتے ہی گھل جاتیں۔ قند پارسی کے لحاظ سے ان میں مٹھاس بھی کچھ زیادہ ہی تھی۔ وسیم نے ملک ٹافیاں ختم کر کے ادھر توجہ دی مگر ان ایرانی ٹافیوں میں خرابی یہ نکلی کہ جلد ہی ختم ہو گئیں۔ اور وسیم کو پتہ بھی نہ چلا کہ مرتبان خالی ہو گیا۔ خیر ـــــــ ابھی اس کا غم غلط کرنے کو بہتیری چیزیں تھیں۔

اتنے میں ایک چھوکرا آیا۔" کیا چاہیے" ـــــــ وسیم نے قریب آ کر اس خیال سے پوچھا کہ شاید گاہک ہو۔

"چاچا عثمان کہاں ہے" لڑکے نے پوچھا۔ حمیدے نے کہلوایا ہے کہ میں نہیں آؤں گا۔ اسے بخار ہو گیا ہے ـــــــ"

"کوئی بات نہیں" وسیم نے جلدی سے کہا "اسے کہہ دینا بے شک نہ آئے اور اب تم بھاگ جاؤ ـــــــ"

مگر لڑکا کھڑا رہا۔

"اچھا۔ تم اس طرح نہیں جاؤ گے" وسیم نے دانت پیس کر اسے دو ٹافیاں دیتے ہوئے کہا۔

"لو ـــــ اور اب دفع ہو جاؤ سنا! بھاگ جاؤ یہاں سے گدھے کی شکل ـــــــ" پھر اسے فوراً ہی اپنا عہد یاد آ گیا اور جلدی سے بولا "معاف کرنا یار۔ یونہی منہ سے نکل گیا تھا۔ـــــــ" لڑکا ٹافیوں کو سینے سے لگائے بھاگ گیا۔

وسیم پھر کاؤنٹر پر آن کھڑا ہوا۔ اور گولیاں منہ میں ڈالے ادھر ادھر مرتبانوں کا جائزہ لینے لگا۔

اتنے میں ایک دبلی پتلی معمر خاتون دکان میں داخل ہوئیں۔

"دکان دار کہاں ہے" انہوں نے گھور کر وسیم کو دیکھتے ہوئے ناخوشگوار لہجے میں پوچھا۔

"چلا گیا" وسیم نے گولیوں بھرے منہ سے بمشکل کہا۔

"تو دکان کون چلا رہا ہے اب؟"

"میں ـــــــــ"

خاتون نے نہایت حقارت سے اسے دیکھ کر بہت برا منہ بنایا۔ اور بولیں "اچھا چاکلیٹ کا ایک ڈبہ دے دو ـــــــــ وہ دو روپے والا" انہوں نے اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔

"وہ۔ وہ تو چار روپے کا ہے۔" وسیم نے نہایت اطمینان سے کہا۔ خاتون جھلا گئیں "مگر کل تو دو روپے کا تھا۔ یہی ڈبہ میں خود لے کر گئی تھی۔ چار روپے کا کب سے ہو گیا؟"

"آج سے" وسیم نے بھی غصیلے لہجے میں جواب دیا پھر فوراً ہی بولا "معاف کیجئے گا ـــــــ"

"اس کی اطلاع تمہیں کہاں سے ملی کہ مہنگے ہو گئے۔ کیا اخبار میں پڑھا تھا ـــــــ؟" خاتون بحث پر تل گئیں۔

"ہاں ـــــــــ" وسیم نے وثوق سے کہا۔

"جھوٹے" خاتون نے چراغ پا ہو کر کہا "ابھی اخبار آیا کہاں ہے۔ عید کی وجہ سے دیر سے ملے گا ـــــــــ"

مگر وسیم ہار ماننے والا نہ تھا۔ فوراً بولا۔ "ہمیں رات کو ہی پتہ چل گیا تھا۔ کہ یہ والے چاکلیٹ مہنگے ہو گئے ہیں۔ اس وقت آپ سوئی پڑی ہوں گی۔ جب ہی ہمیں تار کے ذریعے پتہ چل گیا تھا۔"

وسیم اپنے جھوٹ سے دوسروں کو قائل کرنے کی بجائے خود اپنے آپ کو قائل کرتا تھا۔

"خیر ـــــ میں تو ایک پیسہ بھی زائد نہیں دوں گی۔ یہ لو دو روپے اور ڈبہ مجھے پکڑا دو" ـــــــ خاتون نے جل بھن کر کہا۔

"نہیں جناب۔ ایک پیسہ بھی کم نہ ہو گا۔" وسیم بھی اب ضد پر آ گیا۔

"چار روپے قیمت ہے اس کی ـــــــ"

"بدذات جھوٹے لڑکے" خاتون آتش زیر پا ہو کر بولیں۔ "میں ابھی جا کر پولیس میں تمہاری رپورٹ کرتی ہوں۔ غضب خدا کا جوتیوں سمیت آنکھوں میں گھسا آ رہا ہے۔" اور وہ پرس سنبھال کر باہر نکل گئیں۔ وسیم نے دروازے میں سے انہیں دیکھ کر منہ چڑایا۔ پھر زیر لب بولا۔ "معاف کیجئے گا۔"

اور دروازہ بند کر کے دکان میں چلا آیا۔ مگر دروازہ بند کرتے ہوئے اس پر ایک انکشاف ہوا کہ بند ہوتے وقت اس میں سے ایک نہایت دل آویز سیٹی کی آواز نکلتی ہے۔ چنانچہ وہ بار بار اسے کھولتا اور بند کرتا رہا۔ تا آنکہ اس کے پیچ ڈھیلے ہو گئے اور آٹومیٹک سسٹم ختم ہو گیا' اب وہ اندر آ گیا اور ایک کرسی رکھ کر اوپر شیلف سے لالی پاپ کا ایک مرتبان اٹھایا اور اس میں سے دو چار لالی پاپ نکال کر آہستہ آہستہ چوسنے لگا۔

دروازہ پھر کھلا۔ اس دفعہ اندر آنے والی ایک ننھی سی چھ سات سالہ لڑکی تھی۔ بے حد سویٹ۔ عید کی وجہ سے اس نے بڑا خوبصورت سبز رنگ کا غرارہ سوٹ پہن رکھا تھا۔ گول مٹول چہرے پر بڑی بڑی معصوم آنکھوں میں کاجل لگا رکھا تھا۔ سنہری چھلے دار بالوں میں سفید ربن باندھے وہ بڑی پیاری پیاری لگ رہی تھی۔ وسیم اسے تکتا رہ گیا۔

ننھی نے قریب آ کر جھجکتے جھجکتے کہا "چار آنے کی لالی پاپ دے دو" ـــــــــ اور چونی کاؤنٹر پر رکھ دی۔

وسیم لالی پاپ چوسنا بھول کر مسکرانے لگا تھا۔ ایک بڑی ہی حماقت آمیز مسکراہٹ۔ جو ایک کان سے شروع ہوئی تو دوسرے کان تک پھیلتی چلی گئی۔

پھر وہ مرتبان کی طرف پلٹا۔ اور ڈھیر سارے لالی پاپ نکال کر کاؤنٹر پر رکھ دیئے۔

"لو" اس نے نہایت دریا دلی سے کہا۔ "اور کچھ چاہیے؟"

"مگر میرے پاس اور پیسے نہیں ہیں" لڑکی نے لالی پاپ اٹھا کر حسرت سے کہا۔ وسیم کے دل پر چوٹ سی لگی۔

"نہیں تم ان چار آنوں سے بہت ساری چیزیں لے سکتی ہو۔ آج سب چیزیں بہت سستی

ہیں- ٹافیاں' بسکٹ' کیک' گولیاں' لالی پاپ' سب کچھ سستا ہو گیا ہے-" وسیم کی فیاضی کی کوئی انتہا نہ تھی-

"مگر کیوں ------" لڑکی نے پوچھا ------ پھر خود ہی گویا سمجھ کر مسکراتے لگی- اچھا عید کی وجہ سے"

"ہاں ہاں- عید کی وجہ سے" وسیم جلدی سے بولا- اور مرتبانوں میں سے نکال نکال کر ٹافیاں' لوز نجز' میٹھی سونف کے پیکٹ لالی پاپ اور چنگم' ڈھیروں کے ڈھیر لفافوں میں بھرنے لگا- لڑکی حیرت سے آنکھیں پھاڑے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی-

"یہ دکان تمہاری ہے؟" اس نے پوچھا-

"ہاں" ------ وسیم نے فخر سے تن کر کہا- تو لڑکی پر بے انتہا رعب پڑا- وہ سہم کر خاموش ہو گئی-

آخر بے شمار لفافوں سے لدی پھندی جب وہ باہر نکلنے لگی تو بولی-

"بہت بہت شکریہ ------" وہ بڑی تمیزدار لڑکی تھی دراصل وسیم کی مسکراہٹ اور چوڑی ہو گئی- اس نے نہایت حوصلہ مندی سے کہا "کوئی بات نہیں"-

اور اس کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا حتیٰ کہ وہ موڑ مڑ کر غائب ہو گئی- اس کے جانے کے بعد بھی دیر تک وہ مسکراہٹ وسیم کے چہرے پر ٹنگی رہی ویسے ایک خواب کے سے عالم میں وہ ٹافیاں بھی کھاتا رہا- لیکن بالکل مشینی انداز سے- دراصل اب وہ اتنی چیزیں کھا گیا تھا- کہ مزید کی گنجائش نہ رہی تھی-

اتنے میں سامنے شیشوں میں سے کچھ مانوس صورتیں نظر آئیں- یہ ہاشم' جواد' اور فرخ تھے جو شیشوں کے ساتھ ناکیں چپکائے بڑی بے اعتبار نظروں سے وسیم کو دیکھ رہے تھے-

وسیم نے انہیں اندر آنے کا اشارہ کیا- تو وہ ٹھٹکتے' ادھر ادھر دیکھتے' محتاط قدموں سے اندر آ گئے-

"بھئی یہ کیا بات ہے- دکان دار کہاں گیا- تم یہاں کیسے" ایک ہی سانس میں ہاشم نے پوچھ لیا-

"یہ میری دکان ہے" وسیم نے بے نیازی سے کہا- "آؤ کھاؤ گے کچھ؟" اور اس نے مرتبان آگے بڑھا دیئے- دوسری بار کہنے کی ضرورت ہی نہ پڑی اور تینوں پل پڑے- کچھ چیزیں منہ میں ٹھونسیں اور کچھ جیبوں میں ------ باتیں کرنا دشوار تھا- اور نقصان دہ بھی- اس لیے باتوں سے قطعی پرہیز کرتے ہوئے وہ کھانے میں جٹے رہے- انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا- جیسے الہ

دین کے چراغ والی غار میں آ گئے ہیں- جہاں مٹھائیوں' چنگموں' ٹافیوں اور بسکٹوں کے ڈھیر لگے ہیں ------ کسے معلوم تھا- بچپن میں ان گنت مرتبہ دیکھے ہوئے اس خواب کی اتنی حسین تعبیر نکلے گی-!

ان کے استغراق میں اچانک ایک بدتمیز نے خلل ڈال دیا- یہ ایک لمبا سا لڑکا تھا- ان کے محلے کا نہیں لگتا تھا- کیوں کہ ان چاروں کے لیے قطعی اجنبی تھا-

"ارے یہ کیا کر رہے ہو؟" وہ دروازے میں کھڑا ہو کر بولا- "یہ تو عثمان کی دکان ہے- تم لوگ کہاں سے آ گئے-"

"یہ دکان ہماری ہے" وسیم نے کہا- "تم نکل جاؤ یہاں سے-"

"واہ ------ یہ دکان ہماری ہے" اس نے نقل اتاری "تم چرا کر کھا رہے ہو ------ عثمان کہیں گیا ہو گا- ہے نا- لاؤ یار اب ہمارا حصہ- نہیں تو میں پولیس میں رپورٹ کرتا ہوں تمہاری"-

"جاؤ کرو جا کر ------" وسیم نے کہا-

"تم سیدھی طرح ٹافیاں دیتے ہو کہ نہیں" ---------- وہ وسیم پر جھپٹا ہی تھا کہ اس نے نزدیکی مرتبان اٹھا کر اسے دے مارا- یہ الگ بات ہے کہ وہ اسے لگا نہیں بلکہ دروازے سے باہر جا پڑا- اور اس میں پڑی ہوئی ٹافیاں سب نکل کر سڑک پر بکھر گئیں-

جواباً لڑکے نے بھی کس کر ایک مکہ دیا جو ہاشم کی کمر میں لگا اب کیا تھا- مہابھارت چھڑ گئی- وسیم' ہاشم' جواد اور فرخ' مرتبان اٹھا اٹھا کر غنیم کو مارنے لگے- آخر وہ بے چارا باہر بھاگ گیا- مگر سڑک پر ٹافیاں' چنگم' گولیاں اور لالی پاپ لوٹنے والوں ایک میلہ لگا تھا- نالی میں لڑھکی ہوئی سڑک کے کونوں کھدڑوں میں گری ہوئی چیزیں تک اٹھا اٹھا بچے بھاگے جا رہے تھے-

اور عین اس وقت جب کہ ایک خالی مرتبان اٹھائے ایک فاتحانہ شان سے وسیم اپنے تینوں دوستوں کے آگے بالکل نپولین کی طرح تنا کھڑا تھا------ کہ ---- عثمان آ گیا-

ہاشم' فرخ' اور جواد کا تو خون خشک ہو گیا- اور وہ جلدی سے نظر بچا کر کھسک گئے- البتہ وسیم کے لیے کوئی جائے مفر نہ تھی- وہ بت کی طرح کھڑا رہ گیا-

مگر اس کی خوش قسمتی تھی کہ عثمان کے سسرال والوں نے نکاح کی حتمی تاریخ دے دی تھی- اور بھرپور خوشی کی ترنگ میں اسے دکان کی تاراج شدہ شکل نظر ہی نہ آئی- اور بجائے تھپڑ رسید کرنے کے اس نے جھک کر وسیم کی پیشانی چوم لی-

"وسیم میاں آج میں بہت خوش ہوں- تم لوگوں نے میری بات مان لی- اب میرا بھی گھر

بس جائے گا۔ اور وسیم تمہارا بہت بہت شکریہ۔ کہ تم نے اتنی تکلیف کی" وسیم پر جیسے کسی نے جادو کر دیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کیا کرے۔

"مگر..... مگر عثمان..... وہ تمہاری کچھ چیزیں ٹوٹ گئی ہیں اور ..... اور" وہ ہکلایا۔

"کوئی بات نہیں" عثمان نے ہاتھ ہلایا۔ "کوئی بات نہیں آج میں بہت خوش ہوں ----"

"اچھا خدا حافظ ------"

اور وسیم کن انکھیوں سے دکان کو دیکھتا گھر چلا گیا۔

13

کچھ روز سے افضل بھیا اس گھرانے پر بہت مہربان ہو گئے تھے۔ ان کی بینا سے دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔ اسی بنا پر اکثر ان کا سکوٹر برساتی میں کھڑا نظر آتا۔ ادھر وسیم کے کنبے والے تھے تو نہ جانے کیوں سب کو ان خاص چڑ تھی۔ بینا تو انتہائی بے رخی رتتی، کبھی بات تک نہ کرتی۔ کلیم صاحب کی انہیں دیکھتے ہی تیوری چڑھ جاتی نعیم بھی رکھائی برتتا۔ مسز کلیم ایک آدھ بات کر تیں بھی تو بے اعتنائی سے۔

آخر افضل صاحب نے ایک ماہر سیاستدان کی طرح وسیم کو گانٹھا۔ ایک دن وہ باغ کے گوشے میں بیٹھا اس بات پر کڑھ رہا تھا۔ کہ اسے اتنا ڈھیر سارا ہوم ورک دے دیا گیا ہے کہ وہ اچھی طرح کھیل بھی نہیں سکتا۔

ادھر جواد وغیرہ تو انہیں بھی کچھ روز سے ماں باپ نے ادھر آنے سے روک دیا تھا۔ ساتھیوں کے بغیر اسے زندگی بالکل بے معنی نظر آ رہی تھی۔ اور اسی کوہ غم میں اداس بیٹھا خود کو بہلا رہا تھا کہ افضل صاحب پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔

"کیا ہو رہا ہے یار------ یہاں کیوں بیٹھے ہو-----"

"کچھ نہیں" وہ بگڑ کر بولا۔

"آؤ سکوٹر پر سیر کروا لاؤں" انہوں نے جال پھیلایا۔

وسیم کی آنکھیں چمکنے لگیں "سکوٹر پر سیر؟" اس نے دہرایا۔ اس کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ کتنی کتنی ہی بار اس نے بھیا سے منت کی تھی کہ اپنے سکوٹر پر سیر کرائیں مگر انہوں نے ڈانٹ دیا تھا۔

"ہاں ہاں چلو-----" افضل نے مسکرا کر کہا۔

ذرا سی دیر بعد وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھا افضل کے کانوں میں چلا چلا کر باتیں کر رہا تھا۔ ہوا کے زور سے اس کے بال اڑے جا رہے تھے۔ وہ بے انتہا خوش تھا۔ اور برابر ان چڑیوں ہریلوں کی باتیں کیے جا رہا تھا جو اس نے گزشتہ ہفتے اپنی تیر کمان سے اکیلے ہی شکار کیے تھے۔ آخر افضل نے بڑی ہوشیاری سے موضوع بدلا۔

"وسیم۔ تم کبھی اپنی آپا کے ساتھ باہر جاتے ہو؟"

"کیوں نہیں" وہ سوچ کر بولا "وہ کئی دفعہ مجھے ساتھ بازار لے کر جاتی ہیں۔ یہ ساتھ والا بازار' جو صدر کا ہے"۔

"اچھا اب اگر تم ان کے ساتھ جاؤ۔ تو ایک کام کرنا۔۔۔۔۔" افضل نے کچھ غور و فکر کے بعد کہا۔

"کیا کام۔۔۔۔۔" وسیم نے پوچھا۔

"کوئی ایسی ترکیب کرنا کہ وہ راستے میں تھوڑی دیر رک جائیں"۔ "اچھا" وسیم نے قدرے سوچ کر کہا۔ "مگر کیا بہانہ بناؤں؟"

افضل نے ایک جگہ سکوٹر روک لی۔ اور سمجھاتے ہوئے بولے۔

"یوں کہنا کہ میری طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ یا جو بھی دل چاہے کہ لینا۔ مگر ایسی ترکیب کرنا کہ وہ کچھ دیر کو رک جائیں۔ وہ جو کچی سڑک ہے نا۔ جو پڑول پمپ کے پاس سے گھومتی ہے۔ وہاں"۔

"اچھا۔ اچھا" وسیم نے سمجھ کر گردن ہلائی۔ پھر کچھ دیر غور و فکر کرنے کے بعد بولا "مگر آپ انہیں کیوں ٹھہرانا چاہتے ہیں؟"

"وہ اس لیے بھئی کہ ۔۔۔۔۔ کہ" وہ ہکلانے لگے "ذرا میں نے ان سے کچھ پوچھنا تھا۔۔۔۔۔"

"کوئی ہسٹری وغیرہ۔۔۔۔۔" وسیم نے بزرگانہ انداز میں پوچھا۔

"ہاں ہاں"۔۔۔۔۔" وہ جلدی سے بولے۔ "اچھا آؤ اب گھر چلیں"۔

"وسیم کود کر ان کے پیچھے بیٹھ گیا۔ سکوٹر چلنے لگا تو اس نے پھر باتیں شروع کر دیں۔

"مگر بھائی جان۔ میں جو اتنا کام کروں گا آپ کا تو آپ مجھے دیں گے کیا۔۔۔۔۔" اس نے پوچھا۔ پکا بنیا تھا وہ۔

افضل کچھ دیر خاموش رہے پھر جان چھڑانے کو بولے۔ تم جو کہو"۔

"اچھا۔۔۔۔۔" وہ سوچنے لگا "آپ یوں کیجئے کہ مجھے دو خرگوش کے بچے لا دیجئے۔ بالکل سفید رنگ کے ہوں۔ لال لال آنکھوں والے پیارے بچے۔۔۔۔۔"

"بہت اچھا لا دوں گا" ایسی آسان فرمائش پر افضل بہت خوش ہوئے بھلا مارکیٹ سے دو خرگوش کے بچے خریدنے میں کون سے ہاتھی گھوڑے لگتے تھے۔

"ضرور لائیے گا۔۔۔۔۔ بہت خوب صورت ہوں۔"

"ہاں بھئی وعدہ رہا۔ ضرور لاؤں گا" افضل نے گیٹ کے قریب سکوٹر روکتے ہوئے کہا" لو

اب اتر جاؤ کافی سیر ہو گئی۔

"اور دیکھئے۔ سفید رنگ کے ہوں۔ کالے یا بھورے نہ ہوں۔ اس نے اترتے ہوئے تا کید کی۔

" اچھا بھئی اچھا۔۔۔۔۔ " اور افضل میاں سکوٹر پر ہوا ہو گئے۔ بقیہ سارا دن وسیم نے خرگوش کے بچوں کے خواب دیکھنے میں گزارہ۔ اور دوسرے ہی روز جب بینا اپنے سلے ہوئے کپڑے صدر کے درزی سے لانے چلی تو وسیم میاں نہایت شرافت سے پاس آن کھڑے ہوئے

"آپا۔۔۔۔۔ میں آپ کے ساتھ چلوں؟" انہوں نے معصومیت سے پوچھا۔

"کیوں۔۔۔۔۔" بینا نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔ پھر اچانک سمجھ گئی" اچھا۔ کوئی کھلونا وغیرہ خریدنے کا ارادہ ہو گا؟"

"نہیں آپا۔۔۔۔۔ بالکل نہیں" وسیم نے زور دے کر کہا۔ "میں تو۔۔۔۔۔ صرف آپ کے ساتھ چلوں گا۔ کوئی بنڈل وغیرہ ہی اٹھاؤں گا۔۔۔۔۔"

بینا حیران رہ گئی۔ حیرت کی بات ہی تھی۔ وسیم نے آج تک ایسی انسان دوستی کا ثبوت نہ دیا تھا۔

"اچھا چلو۔۔۔۔۔ مگر یاد رکھو۔ خرید کر کچھ نہیں دوں گی۔ جو ٹافیاں وغیرہ مانگنے لگ جاؤ"۔

اور وسیم نہایت فرماں برداری سے بہن کے ساتھ چل پڑا۔ گھر سے صدر تک کا راستہ تقریباً نصف میل کا تھا۔ اسے بینا اکثر پیدل ہی طے کیا کرتی تھی۔ سیر کی سیر ہو جاتی۔ اور کام بھی کر لیتی۔

آج بینا کی حیرت کی انتہا نہ تھی۔ کیوں کہ ٹافیاں' مٹھائیوں' سموسوں اور کھلونوں وغیرہ کی دکانوں کی طرف وسیم نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ اور نہ ہی کسی چیز کے خریدنے کی فرمائش کی۔ ورنہ وسیم اور دکانوں کے پاس سے یونہی گزر جائے! ناممکن۔۔۔۔۔! بہر حال یہ حقیقت تھی کہ آج اس نے کسی قسم کا مطالبہ نہ کیا۔ اور کپڑوں وغیرہ کے پیکٹ اٹھائے نہایت سعادت مندی سے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ دراصل وہ خرگوش کے بچوں کے حسین تصور میں مگن تھا۔

آخر وہ اشیائے مطلوبہ لے کر واپس ہوئے۔ چلتے چلتے کچی سڑک آ گئی تو وسیم جیسے چونک پڑا۔

"آپا۔ میرے ٹخنے میں موچ آ گئی ہے" وہ کراہتا ہوا دھم سے نقاؤں سمیت زمین پر بیٹھ گیا" میں نہیں چل سکتا"۔

بینا ششدر سی رہ گئی' پھر رونی آواز میں بولی' "کم بخت۔ تجھے بھی اسی وقت ٹخنہ توڑنا تھا۔ اب کیا کروں۔ آس پاس کوئی آدمی بھی تو نظر نہیں آتا جو تجھے اٹھا کر لے چلے۔۔۔۔۔ آؤ میرے بازو کا سہارا لے لو۔"

وسیم ٹس سے مس نہ ہوا۔ اور بدستور بیٹھا رہا۔ تو وہ جلا کر بولی" اٹھ کر چلنے کی کوشش تو کرو۔ شاید ٹخنہ ٹھیک ہو جائے۔ آؤ میں مدد کروں۔۔۔۔۔"

"نہیں۔ مجھ سے بالکل نہیں اٹھا جاتا" وہ کراہ کر بولا۔

"اف اللہ۔ اب میں کیا کروں" بینا گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اتنے میں عین پروگرام کے مطابق افضل میاں وہاں یوں وارد ہوئے جیسے محض اتفاقاً آ گئے ہوں۔

"اسے کیا ہوا۔" انہوں نے وسیم کو دیکھ کر تشویشناک لہجے میں پوچھا۔

اس پر بینا نے اپنی پتا کہہ سنائی۔

"اوہ۔ تو یہ بات ہے" وہ جوانمردی سے مسکرائے۔ پھر وسیم سے بولے "آؤ میاں تم میرے کندھے پر چڑھ جاؤ۔ اپنے پارسل وغیرہ بھی مجھے تھما دو۔۔۔۔۔ آؤ"۔

اور وسیم نہایت آرام سے ان کے کندھے پر چڑھ بیٹھا۔ بینا کی ممنونیت کی انتہا نہ تھی۔۔۔۔۔ اس وقت افضل بھائی اسے سیدھا خدا کی طرف بھیجا ہوا فرشتہ لگ رہے تھے۔

افضل میاں چلتے رہے۔ اور ساتھ ساتھ نہایت محتاط انداز سے باتیں بھی کرتے گئے۔ اپنی طرف سے انہوں نے نصف میدان مار لیا تھا۔ گویا اسی جدوجہد میں میاں کو لادے لادے ان کے کندھے ٹوٹنے لگے تھے۔ تاہم انہوں نے اس تکلیف کو عارضی سمجھ کر سہ لیا۔

گیٹ آ گیا تھا۔ افضل نے وسیم سے کہا" چلو بھائی اترو اب اور ذرا چل کے دیکھو۔ شاید ٹانگ ٹھیک ہو گئی ہو۔۔۔۔۔" اور واقعی وسیم کی ٹانگ ٹھیک ہو گئی تھی۔ وہ بغیر لنگڑائے آرام سے چلنے لگے۔ بینا حیران رہ گئی اس پر افضل نے شک دور کرنے کی غرض سے جلدی سے کہا "میرا خیال ہے ٹانگ کا کوئی پٹھا کھنچ گیا ہو گا جسے یہ حضرت موچ سمجھے۔ ورنہ ٹخنے کی موچ۔ توبہ۔ توبہ۔ خدا پناہ دے چار روز تو آدمی زمین پر قدم نہیں رکھ سکتا۔۔۔۔۔"

بینا مطمئن ہو کر اندر چلی گئی۔

دوسرے ہی روز حسب وعدہ وسیم میاں کو دو عدد خرگوش کے بچے دے دیے گئے۔ اس واقعے کے بعد سے افضل کے لیے گھر والوں کی ناپسندگی قدرے کم ہو گئی۔ جس پر وہ باغ باغ تھے۔

14

"مگر تم نے اسے لیا کہاں سے؟" کلیم صاحب نے غضبناک ہو کر پوچھا۔

وسیم مسمسی شکل بنائے کھڑا تھا۔

"ایک دوست سے" اس نے کہا۔

"کون سا دوست؟" انہوں نے طیش میں آ کر پوچھا۔

"افضل بھائی۔۔۔۔۔" وسیم نے بتایا "یہ ان سے لیا تھا میں نے مگر ابا جان مجھے پتہ نہیں تھا یہ آپ کے سلیپر میں گھس کر اسے کتر ڈالے گا۔ میں نے تو اسے گتے کے ڈبے میں بند کر کے رکھا تھا۔ پتہ نہیں کیسے نکل گیا۔۔۔۔۔"

وسیم میں ایک بہت بڑا وصف یہ تھا کہ وہ ہنگامی حالات میں بھی اوسان بجا رکھتا تھا۔ اور باقاعدہ اپنی صفائی میں دلائل دیتا۔

"مگر اس کم بخت افضل نے یہ بد ذات جانور تمہیں دیا کیوں آخر؟" ابا دھاڑے۔

روبینہ پاس ہی کھڑی تھی۔ مڑ کر بولی "ابا جان افضل بھائی بچوں سے بہت پیار کرتے ہیں۔ اس نے فرمائش کی ہو گی۔ انہوں نے لا دیا۔۔۔۔۔"

"یہ مردود جانور اور کتنے ہیں تمہارے پاس؟" کلیم صاحب نے بینا کی بات سُنی ان سنی کرتے ہوئے وسیم سے پوچھا۔

"جی دو"۔

"خدایا" انہوں نے سر تھام لیا "اور دوسرا کہاں ہے؟"

"جی گیراج میں۔۔۔۔۔"

"اچھا۔ اس دوسرے کو بھی وہیں لے جاؤ۔ کم بخت نے میرا انگوٹھا بھی چبا ڈالا۔ بینا کہیں سے ٹنکچر تو لاؤ۔۔۔۔۔"

وہ کراہ کر بولے۔ بینا دوائی لانے چلی گئی۔

اس رات وسیم نے قانون کی پابندی کرتے ہوئے خرگوش کے بچے کو کمرے سے نکال کر گیراج میں بند کر دیا۔ مگر صبح کے قریب بینا کی چیخوں سے سارا گھر جاگ اٹھا۔ سب اس کے کمرے میں اکٹھے ہو گئے۔

امی- امی- پتہ نہیں کیا چیز تھی" وہ ہسٹریائی انداز میں چیخی- وحشت سے آنکھیں پھٹی ہوئی تھی- "میرے سر پر سے چرے پر کودی مجھے پنجے بھی مارے اور بھاگ گئی-----" کمرے میں اس چیز کی ڈھنڈیا پڑی- تو مجرم ایک گرگابی میں چھپا ہوا ملا- یہ وسیم کا پیارا سفید خرگوش تھا- جو اس نے جلدی سے اٹھا کر سینے سے لگا لیا گویا ظالم دنیا سے بچانا چاہتا ہو-

"میں نے تمہیں کہا تھا کہ اسے کمرے میں نہ رکھنا" ابا پاس آ کر بولے-

"مگر ابا جان نے اسے کمرے میں کب رکھا تھا- میں نے تو اسے گیراج میں بند کر دیا تھا- یہ وہ نہیں- دوسرا بچہ ہے---- پنکی----"

"تو یہ کیسے آیا؟" وہ بدستور تحمل سے بولے-

"یہ تو- اسے بھی میں نے کمرے میں نہیں رکھا تھا- کھڑکی کے باہر والی دہلیز پر رسی سے باندھ دیا تھا- اب یہ میرا قصور تو نہیں اگر یہ رسی کاٹ کر اندر آ جائے اور ----"

"اچھا- آئندہ ان دونوں میں سے کسی کو بھی میں نے گھر کے اندرونی کمروں میں پایا تو گردن مروڑ دوں گا- سمجھے؟----"

اور اسی روز جب فتح مندی کے جذبے میں سرشار' افضل میاں آئے- تو گھر بھر کا رویہ ہی بدل گیا- سب کی پسندیدگی جانے کہاں اڑ گئی تھی- بینا بھی نہایت رکھائی سے ملی- اور شکایت کی کہ آپ نے خواہ مخواہ وہ فضول سے جانور وسیم کو دلا دیے- جو وہ گھر بھر کے عذاب بنے ہوئے ہیں- افضل نے بہتیرا پچویشن سلجھانے کی کوشش کی- مگر بے سود- تھک ہار کر وہ باہر آئے تو لان میں وسیم میاں اپنی چھنگلیا میں پٹی باندھے بیٹھے تھے-

"دیکھئے اس خرگوش کے بچے نے مجھے کاٹ لیا" اس نے غصہ میں بھر کر ملامت آمیز انداز میں کہا- "میں اسے ڈانس سکھا رہا تھا کہ یوں مڑا اور چٹ سے میری انگلی میں کاٹ کھایا"-

"اوہو-" افضل نے ہمدردی سے کہا "مگر تم نے خود ہی تو مانگے تھے یہ بچے-"

"ہاں مانگے تھے- مگر کاٹ کھانے والے بچے نہیں- ایسے بچے جو شریف ہوں اور لوگوں کو ڈرائیں یا کاٹیں نہیں" اس نے منہ بنا کر کہا-

"اچھا دیکھو-" افضل نے قریب آ کر کہا" امی کو مت بتانا کہ اس نے تمہاری انگلی میں بھی کاٹ کھایا ہے- وہ سب پہلے ہی بہت ناراض ہو رہے ہیں-----"

"اچھا نہیں کہوں گا----" وسیم نے فوراً صلح کر لی "میں کہہ دوں گا کھیلتے میں چوٹ لگ گئی ہے- مگر آپ اس کے بدلے مجھے دیں گے کیا-؟"

انتہا کا بلیک میلر تھا وہ--- خیر خود کردہ را علاجے نیست----- افضل نے ایک روپیہ

نکال کر اسے دیا اور دانت پیستے ہوئے چلے گئے-

دوسرے روز وسیم اس عطا کردہ روپے سے سرکس دیکھنے چلا گیا خوب جھولے لیے ---- خیموں میں رکھے ہوئے عجائبات دیکھتا رہا- چاٹ کھائی- رنگ برنگے غبارے خریدے' موت کا کنواں اور "عورت نما" لومڑی دیکھی- اس کے بعد وہ آئس کریم کے سٹال پر چلا گیا- وہاں ایک کوکا کولا پی چپس بھی لینا چاہتا تھا- کہ دیکھا پیسے ختم ہو چکے ہیں- وہ ٹھنڈی سانس بھر کر وہاں سے نکل آیا- شام کے قریب گھر پہنچا تو سب کھانے کی میز پر بیٹھے تھے میاں افضل بھی موجود تھے- اور اس کا انتظار ہو رہا تھا- مگر اس نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا- پیٹ بھرا ہوا تھا- کیسے کھاتا- مگر امی کو اصل وجہ چونکہ معلوم تھی- وہ فکر مند ہو گئیں-

"کیوں بیٹے- کیوں نہیں کھاتے کھانا؟ طبیعت تو ٹھیک ہے؟" "جی امی- وہ- میں نے سرکس میں کچھ پکوڑے اور چاٹ کھائی تھی بس دل بھر گیا- اب کھانا نہیں کھاؤں گا----"

"کس نے دیے تھے تمہیں پیسے؟" ابا نے پوچھا-

افضل کی نگاہیں اس سے ملیں تو وہ جھجک کر بولا-'

"جی ایک دوست نے دیے تھے- وہ مجھے اپنے ساتھ سرکس لے گیا تھا-"

"بعض لوگوں میں یہ بڑی بری عادت ہوتی ہے کہ خواہ مخواہ پیسے دے دیتے ہیں-" بینا نے ناک چڑھا کر کہا- "اسی طرح بچے کی عادتیں خراب ہوتی ہیں-"

اور افضل میاں کو پھنسا ہوا لقمہ نگلنے کے لیے پانی کا سہارا لینا پڑا کھانے کی میز پر سے اٹھ کر وسیم نے باہر کا رخ کیا- افضل نے بھی گھر والوں کو خدا حافظ کہا اور اس کے ساتھ ہی باہر نکل آیا-

"یہ وہی ایک روپیہ تھا- جو آپ نے دیا تھا-" وسیم نے چپکے سے کہا-

"اچھا؟" مگر کسی سے بتانا نہیں- لو یہ آٹھ آنے----"

اور وسیم نے اطمینان سے وہ آٹھ آنے جیب میں ڈال لیے- اور دل ہی دل میں دعا مانگنے لگا- کہ افضل بھائی ہمیشہ آتے رہیں' تاکہ روپوں پیسوں کی بارش اسی طرح ہوتی رہے-

اگلے روز جمعہ تھا- اور کچھ عرصے سے کلیم صاحب نماز کے بڑے پابند ہو گئے تھے- گھر والوں کے لیے یہ پابندی سخت کر دی گئی- مسز کلیم تو خیر پہلے بھی پابند تھیں- لیکن نعیم' بینا' حتیٰ کہ وسیم کو بھی کلیم صاحب نے ہر روز لیکچر پلا پلا کر اس بات پر آمادہ کر لیا تھا- کہ حتی الوسع نماز نہ چھوڑی جائے- چنانچہ آج بھی نعیم اور وسیم دونوں بھائی کلیم صاحب کے ساتھ جمعہ کی نماز پڑھنے جامع مسجد جا رہے تھے-

وسیم نے جلدی جلدی وضو کر کے سفید شلوار قمیض پہنی اور اوپر خواہ مخواہ ہی کوٹ بھی پہن لیا۔ نعیم نے اعتراض بھی کیا کہ اب مارچ کے مہینے میں کوٹ پہننے کی کیا علت ہے۔ مگر اس نے پرواہ نہ کی۔ اور کوٹ پہنے ساتھ چل پڑا۔ دراصل اس کوٹ کی ایک جیب ننھے سے ونکی کی پناہ گاہ کا کام دے رہی تھی۔ وسیم سارا رستہ ایک ہاتھ جیب میں ڈالے مضبوطی سے اسے پکڑے رہا۔ خیال تھا۔ مسجد میں جب سب لوگ نماز میں مصروف ہوں گے۔ پچھلی صفوں میں اطمینان کے ساتھ ونکی کھیلا جائے گا۔

خطبے کے وقت وسیم کو عین ابا کے پیچھے بیٹھنا پڑا۔ وعظ بے حد دل نشین تھا۔ اسے غور سے سنتے ہوئے اس کی گرفت ذرا ڈھیلی پڑ گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ونکی میاں کود کر ابا کے کندھے پر جا چڑھے۔ سارے نمازیوں میں ہلچل مچ گئی۔ لوگ اٹھے تو نہیں مگر گردنیں بڑھا بڑھا کر ادھر دیکھنے لگے۔ اس پر مولوی صاحب کو کھنکارنا پڑا۔ غصے کے مارے کلیم صاحب کا برا حال تھا۔ مگر انہوں نے خاموشی سے ونکی کو ہاتھ میں پکڑ کر نعیم کے حوالے کر دیا۔ وہ بھی اسی خاموشی سے اٹھا اور اسے جا کر باہر پھینک آیا۔

اس کارروائی پر وسیم نہ رہ سکا اور سرگوشی میں بولا "بھائی جان وہ خرگوش میرا ہے آپ نے باہر کیوں پھینک دیا۔؟

"چپ" تیوری چڑھا کر نعیم نے کہا۔

اس پر وہ کچھ اور کہنا چاہتا ہی تھا کہ کلیم نے مڑ کر ایسی خون آشام نظروں سے اسے دیکھا کہ چپ کرتے ہی بنی۔

"اچھا خیر۔ میرے پاس پنکی تو ہے" اس نے دل کو تسلی دے لی واپسی پر جب وہ گیراج کے پاس پہنچے۔ تو بنگو بھاگتا ہوا پیشوائی کے لیے آیا۔ اس کے منہ میں کوئی ادھیڑی ہوئی سفید چیز تھی جسے بڑے فخر سے چمکتی آنکھوں کے ساتھ اس نے وسیم کے حضور پیش کر دیا۔ اور وسیم پتھر بن کر رہ گیا۔ یہ بے چارے پنکی کی باقیات تھیں۔ نعیم باوجود غصے کے اس وقت وسیم سے ہمدردی کیے بغیر نہ رہ سکا۔ ابا آگے نکل گئے تھے۔ وہ پاس ہی کھڑا ہو گیا۔

"بہت افسوس ہے وسیم۔ بنگو خبیث نے اسے بھی مار ڈالا" "ہوں" وسیم نے پھنکار سی ماری' "اور دوسرے کو آپ نے بھگا دیا۔

"آئی ایم سوری" نعیم نے صدق دل سے کہا اور اندر چلا گیا۔ وسیم کچھ دیر کھڑا پنکی پر فاتحہ پڑھتا رہا۔ پھر باقاعدہ قبر کھود کر اسے دبا دیا۔

اس واقعے کے بعد اس کے دل سے بالکل اتر گیا۔ وہ سوچنے لگا کاش اس سے بہتر کتا کہیں سے مل جائے تو وہ اس سے بالکل بائیکاٹ کر دے گا۔

15

کلیم صاحب نے احتیاط سے تیر کمان اپنی الماری میں رکھ کر تالا لگا دیا اور چابی جیب میں رکھ لی۔ وسیم بڑی سنجیدگی اور اداسی سے یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔

"تین کھڑکیوں کے شیشے اور ایک پڑوسیوں کی بلی" انہوں نے مڑ کر سختی سے کہا۔

"مگر ابا جان کوئی میں نے جان بوجھ کر تو اس بلی کو نہیں مارا تھا" وسیم نے احتجاج کیا "وہ تو یونہی راستے میں آ گئی تھی۔ تو اس کو تیر لگ گیا۔ اب اس میں میرا کیا قصور۔ اور شیشے بھی میں نے جان بوجھ کر نہیں توڑے۔ میں نے کوے کا نشانہ لیا تو تیر ادھر چلے گئے۔ ابھی مجھے پریکٹس نہیں ہے نا۔۔۔۔۔"

"لیکن اب تمہیں مزید پریکٹس کا موقع نہیں دیا جائے گا۔" انہوں نے رکھائی سے کہا۔ وسیم مایوس ہو کر باہر چلا آیا۔ اور یونہی ادھر ادھر پھرنے لگا۔ پڑوسیوں کی لڑکی بھی نہ تھی جو اس سے غلط کرنے کو دو باتیں کر لیتا۔ نہایت دل شکستہ ہو کر وہ باہر سڑک پر نکل گیا اور دونوں ہاتھ پشت پر باندھے' سر جھکائے آہستہ آہستہ چہل قدمی کرنے لگا۔ دنیا اسے اس وقت تاریک نظر آ رہی تھی۔ بھلا تیر کمان کے بغیر زندگی بھی کوئی زندگی تھی؟

وہ سوچ رہا تھا۔ اس کے سب ساتھیوں کے پاس تیر کمان ہوں گے بس ایک وہی خالی ہاتھ ہو گا۔ نہیں۔ وہ ان کے پاس نہیں جائے گا۔ آج پھر اسے ابا کی ناانصافی کا خیال آ گیا۔ بھلا اس کمینی سی بلی کو تیر مارنے کی اتنی سخت سزا مناسب تھی؟ اور کھڑکیوں کے شیشے۔۔۔۔۔ ہونہہ۔ ایسے شیشے وہ جتنے کہیں' لا کر لگا سکتا ہے بھلا شیشے فٹ کرنا بھی کوئی مشکل کام ہے۔

"بالکل سڑی بسی بلی تھی وہ"۔۔۔۔۔ اس نے خود سے کہا۔ "بالکل بوڑھی مریل سی بلی۔۔۔۔۔ اور تیر اسے اچھی طرح لگا بھی نہیں"۔

خواہ مخواہ چیخنے چلانے لگی اور سب کو اکٹھا کر لیا۔۔۔۔۔ ہونہ۔۔۔۔۔"

وہ رک گیا۔ کوئی چیز اس کے پیچھے آ رہی تھی۔ اس نے گھوم کر دیکھا تو ایک کتا تھا۔ جو رقص کرنے کے انداز میں' آنکھیں چمکائے تھوتھنی اٹھائے' مسکراتا ہوا اس کے پیچھے چلا آ رہا تھا۔

وسیم رکا تو وہ بھی رک کر ہلکے سے بھونکا جیسے خوش آمدید کہہ رہا ہو۔ پھر آنکھوں میں

اشتیاق و محبت کی ایک دنیا سمیٹے وہ کھڑا ہو گیا۔

"جاؤ چوہے پکڑ لاؤ" وسیم نے یونہی کہہ دیا۔

کتے نے ہلکی سی چلانگ لگائی اور مزید احکامات کے انتظار میں کھڑا ہو کر دم ہلانے لگا۔

اس پر وسیم نے پاس کی جھاڑی سے ایک شاخ توڑی اور اس کی طرف پھینکی۔ کتا اس پر جھپٹا اور شاخ اٹھا کر اسے پنجوں اور تھوتھنی سے یوں بھنبھوڑنے لگا۔ جیسے کسی چوہے وغیرہ کو پکڑا ہو۔ اسے ہوا میں اچھالا۔ بھاگ کر دبوچا' اس پر کھڑا ہو کر غرغرانے لگا' آخر اسے لے کر وسیم کے پاس آ گیا' اور ہانپتے کانپتے ہوئے' اپنی منتظر مسکراتی ہوئی آنکھیں اشتیاق سے اوپر اٹھا دیں گویا کہہ رہا ہو' "آؤ اور کھیلیں------"

وسیم کا کرتا ہوا حوصلہ اور امیدیں اب بحال ہو چکی تھیں۔ اس نے قریب آ کر کتے کا پٹہ دیکھا اس پر "جولی" لکھا تھا۔ گویا کسی نہایت تمیزدار گھرانے کی ملکیت تھا یہ------

"جو---لی-----!" پکارتے ہوئے وسم نے تحاشا بھاگا۔ اس کا چہرہ مسرت سے تمتما رہا تھا۔ کتا تیر کی طرح پیچھے لپکا۔ آخر کچھ دور جا کر وسیم رک گیا تو وہ بھی کھڑا ہو کر اس کے بوٹ سونگھنے لگا۔ وسیم نے ایک اور شاخ توڑ کر اسے دور پھینک دیا۔ کتا اس کی مرضی سمجھ کر لپکا۔ اسے پکڑ کر جھنجھوڑتا رہا۔ پھر منہ میں ڈال کر چبایا اور کچلی شاخ لا کر وسیم کے قدموں میں ڈال دی۔

"شاباش" وسیم چلایا "شاباش جولی! چلو آؤ" اور وہ قریبی آبادی کے کچے پکے مکانوں کے پاس سے گزرنے لگے۔ کتا پیچھے پیچھے زبان نکالے' پر اشتیاق نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا' کبھی کبھار کسی چڑیا کو دیکھ کر بھونکتا۔ بڑی مستعدی سے چلا آ رہا تھا۔

چنانچہ آخر کار' اسے ایک نہایت عمدہ' ذہین' فرمانبردار کتا' جو خالصتاً اس کا "اپنا" تھا۔ مل گیا تھا۔ قدرت کی اس خاص الخاص مہربانی پر وہ اس کا بہت شکر گزار تھا۔

دونوں کا دن بہت اچھی طرح گزرا۔ وہ مزے سے تالاب میں تیرتے رہے۔ باہر نکل کر جالی نے ایک جھرجھری لے کر اپنے بدن کا سارا گیلا پن وسیم پر جھاڑ دیا' پھر ایک مرغی کے پیچھے بھاگا وہ کڑ کڑا کر گھر میں گھس گئی تو ایک بلی کے پیچھے پڑ گیا۔ گاؤں والوں کی بھینسیں تھان پر واپس آ رہی تھیں انہیں دیکھ کر بھونکنے لگا۔ کسی نے باہر رسی پر اپنا کھیس سکھانے کے لیے ڈال رکھا تھا۔ اسے جا کر کھینچ لیا اور اپنے اوپر گرا لیا۔

غرض خوب شرارتیں کرتا رہا۔ وسیم اس کی ہر ہر ادا پر دل و جان سے فریفتہ ہوا جا رہا تھا۔ جولی واقعی ایک انتہائی شریر' مسخرا اور محبت کرنے والا کتا تھا۔ اسے بھلا کیوں کر نہ پیار کرتا۔ یہ

بالکل اس کی مرضی کے مطابق تھا۔ اور پھر کمال یہ کہ وہ وسیم سے اس قلیل عرصے میں پوری طرح ہل بھی گیا تھا۔

اس روز دوپہر کے کھانے پر وسیم دیر سے گھر آیا۔ سب لوگ اس کے انتظار سے اکتا کر کھانا شروع کر چکے تھے۔ وہ چپکے سے اپنی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ ابا کھانے کے ساتھ ساتھ اخبار بھی پڑھ رہے تھے۔

"وسیم" اس کی امی بولیں "میرا دل چاہتا ہے کسی روز تو تم وقت پر کھانا کھاؤ"۔

وسیم نے خاموشی میں مصلحت سمجھی اور ہاتھ اٹھا کر ماتھے پر گرے ہوئے بال سنوارنے لگا۔

"امی۔ ذرا اس کے ہاتھ تو دیکھئے" بینا نے کراہت سے کہا۔

"سارے مٹی میں سنے ہیں"۔

وسیم نے جلدی سے ہاتھ نیچے کر لیا اور بینا کو خون خوار نظروں سے گھورا وہ اسی طرح اس کی پردہ داری کرتی تھی۔

"جاؤ وسیم جا کر اپنے ہاتھ دھوؤ" مسز کلیم نے تحمل سے کہا۔ وسیم کے ساتھ گزرے ہوئے نو دس سال انہیں متحمل مزاج بنا چکے تھے۔ وسیم بدتمیزی سے اٹھا اور بڑبڑانے لگا "کب گندے ہیں میرے ہاتھ------ پہلے کئی دفعہ اس سے بھی زیادہ گندے تھے مگر آپ نے دھونے کو نہیں کہا---- اب میں سارا دن تو انہیں دھو نہیں سکتا۔ بعض قسم کے ہاتھ جلدی گندے ہو جاتے ہیں تو آدمی کیا سارا دن انہیں دھوتا ہی رہے؟ دھونے سے تو-----"

ابھی اس کی تقریر جانے کتنی دیر جاری رہتی جواباً ابا نے اخبار نیچے کر کے گھورا تو مجبوراً وسیم کو باہر جانا ہی پڑا۔

"اور امی ذرا بوٹ تو دیکھیں اس کے" بینا نے جاتے ہوئے اس کی طرف توجہ دلائی۔ "سارا کیچڑ تھپا ہے۔ معلوم ہوتا ہے آج یہ حضرت سارا دن تالاب میں کھیلتے رہے ہیں۔"

وسیم تھوڑی دیر بعد واپس آیا تو چہرہ دھلا ہوا اور بال یوں سنورے ہوئے تھے جیسے کسی نے استری کی ہو۔

"امی اس کے ناخن-----" بینا نے کہنا شروع ہی کیا تھا کہ مسز کلیم نے بات کاٹ کر پوچھا" "نعیم۔ نئے لوگ جو سامنے والی ہٹ میں آئے ہیں۔ کون ہیں؟ پتہ چلا؟"

"کوئی آرٹسٹ ہے امی" نعیم نے پلیٹ میں کھانا نکالتے ہوئے کہا "ننگی سا آدمی لگتا ہے۔ ایک چھوٹی سی بیٹی ہے------ بیوی شاید مر چکی ہے۔ اکیلا ہی ہے"۔

وسیم نے کتے کے بارے میں اعلان کرنا ضروری سمجھا۔

"امی جان- میں ایک نیا کتا لایا ہوں" وہ قدرے اہمیت سے بولا-

"کیسا کتا؟ کس کا کتا؟ کسی سے لائے ہو؟" بینا اور نعیم نے یہ سارے سوالات ایک ہی دم میں پوچھ ڈالے-

"مجھے کسی نے نہیں دیا" اس نے بتایا "بس خود ہی آ گیا ہے میرے پاس- آج صبح وہ خود بہ خود ہی کہیں سے آ کر میرے پیچھے پیچھے چلنے لگا- میں نے بہتیرا بھگایا اسے- مگر بھاگا ہی نہیں جہاں بھی میں جاتا- میرے پیچھے آتا------ اب میں زبردستی تو بھگا نہیں سکتا تھا اسے وہ میرے ساتھ گھر پہ چلا آیا------"

"اب کہاں ہے یہ کتا"؟ کلیم صاحب نے تشویشناک لہجے میں پوچھا-

"پیچھے والے باغ میں------" اس نے بتایا-

"اف- اس نے میری ساری گلاب کی کیاریاں برباد کی دی ہوں گی" کلیم صاحب اخبار کی تہ کر کے اٹھ کھڑے ہوئے-

"نہیں ابا جان" وسیم جلدی سے بولا "میں نے اسے باندھ دیا تھا-"

"کہاں باندھا تھا------" انہوں نے پوچھا-

"وہ یہ کیاریوں کے پاس شہتوت کا درخت ہے نا- اس کے ساتھ"-

"کیاریوں کے ساتھ؟" وہ جھلا کر بولے- پھر اس نے ضروری کیاریاں کھود ڈالی ہو گی-----"

"اور اسے کھلایا کیا ہے-؟" نعیم نے سختی سے پوچھا-

"کچن میں سے کچھ بے کار چیزیں لے کر اسے ڈال دی تھیں-" وسیم نے لاپروائی سے کہا- ابا گھڑی دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے "اچھا وسیم- تم آج ہی اس کتے کو پولیس سٹیشن لے جاؤ- تاکہ وہ لوگ اس کے اصلی مالکوں تک پہنچا دیں-----"

"پولیس اسٹیشن؟" وہ حیران رہ گیا- "مگر کیوں ابا جان؟ وہ گم تو نہیں ہوا- نہ اس کا کوئی مالک ہے- وہ تو ایسے ہی آ گیا تھا اور وہ بے چارہ آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں دے رہا- اسے اپنے کمرے میں سلا لوں گا اور-----"

ابا کمرے سے باہر چلے گئے تھے' وسیم رنجیدہ ہو کر خاموش ہو گیا-

"بیٹے- تمہیں پتہ ہے کہ کتے کو پولیس اسٹیشن تو پہنچانا ہی ہو گا- کسی کا پالتو جانور نہیں لیتے" امی نے کہا "ہمارے پاس اپنا کتا تو سہی بنگو- کیا وہ تمہیں پسند نہیں؟"

"نہیں-----" اور وسیم منہ لٹکائے میز پر سے اٹھ گیا-

تھوڑی دیر بعد وسیم انتہائی غمگین شکل بنائے سڑک پر جا رہا تھا- پیچھے پیچھے جولی بہادر تھے- کتا بچارا آنے والی جدائی کے جاں گسل احساس سے بے خبر زبان باہر نکالے' مشتاق قدموں سے وسیم کے پیچھے چلا جا رہا تھا- پولیس سٹیشن زیادہ دور نہ تھا- گیٹ کے قریب وسیم رک گیا- اور پیچھے منہ کر کے بولا "لو بھئی جولی------ یہ ہے پولیس سٹیشن- تم اس میں چلے جاؤ"-

یہ کہہ کر وہ ایک طرف کھڑا ہو کر انتظار کرنے لگا- مگر کتے نے سنی ان سنی کر دی اور ایک بڑے سے پتھر سے کھیلنے لگا اسے لڑھکا کر اس پر بھونکا اور پھر بڑے فاتحانہ انداز میں وسیم کو دیکھنے لگا-

"جاؤ نا اندر" وسیم نے فرض کے تحت کہا "جاتے کیوں نہیں" مگر کتے نے قریب آ کر اس کے بوٹ سونگھنے شروع کر دیے گویا کسی نئے حکم کا منتظر ہو-

وسیم نے آہ سرد بھری اور واپس کے لیے مڑ گیا- کتا اس کے پیچھے پیچھے تھا- آس پاس کی جھاڑیوں پر بیٹھے ہوئے پرندوں پر بھونکتا' ننھے منے گڑھوں کو پلٹتا وہ مزے سے اس کی ایڑیاں سونگھتا چلا آ رہا تھا-

وسیم کو اس کے تعاقب کا علم تھا- مگر وہ کیا کرتا- اس نے بہر حال اپنا فرض ادا کر دیا تھا-----!

16

وسیم گھر پہنچا تو سب لوگ نہ جانے کہاں تھے۔ چنانچہ اس نے بڑی آزادی سے جولی کو ساتھ لے جا کر اپنے کمرے میں بند کر دیا۔

شام کو کھانے پر ابا نے پوچھے۔ "وسیم تم کتے کو پولیس سٹیشن چھوڑ آئے تھے کہ نہیں۔؟"

"جی" اس نے سعادت مندی سے سر جھکا کر کہا۔

"ان لوگوں سے کیا کہا تھا تم نے؟" "جی کچھ نہیں۔۔۔۔۔" وہ بدستور سر جھکائے اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ رہا۔

"مجھے آج ان کیاریوں میں نئے سرے سے پودے لگانے ہوں گے۔ سب اکھڑ گئے" کلیم صاحب بیزاری سے بولے۔

"اور وسیم تم نے اس کتے کو الماری میں رکھا ہوا گوشت اور ڈبل روٹی ساری کھلا دی؟"۔۔۔۔۔ امی نے پوچھا۔

وسیم خاموش رہا۔ "تم نے کتا کہاں چھوڑا تھا۔ اندر؟" ابا نے پوچھا۔

"جی نہیں۔ گیٹ پر" وسیم نے مسمسی صورت بنا کر کہا۔ اور کلیم صاحب ٹھنڈی سانس بھر کر نعیم سے مخاطب ہوئے۔

"تم ابھی اس کتے کو پولیس سٹیشن چھوڑ کر آؤ۔"

"بہتر ابا جان" اس نے مستعدی سے کہا۔ اور جب نعیم اٹھ کر چلا تو وسیم بھی پیچھے تھا۔ کمرے کا دروازہ کھولا گیا۔ جولی کود کر باہر آ گیا۔ تو بڑی مشکل سے اسے دھکیل کر دونوں اندر لائے اور دروازہ بند کر لیا۔ دراصل نعیم اسے دیکھنا چاہتا تھا۔ وسیم نے اس کی دلچسپی سے فائدہ اٹھا کر بڑے دردناک انداز سے اپیل کی۔

"دیکھا بھائی جان آپ نے؟ کتنا اچھا کتا ہے۔ یہ اتنی جلدی سارے ٹرک سیکھ گیا ہے کہ حد نہیں۔ دیکھیں پچھلی دونوں ٹانگوں پر کھڑا ہو کر آپ سے ہاتھ ملاتا ہے۔ یہ بہت اچھا کتا ہے بھائی جان۔ اور ایسے کتے کو ابا جان کہتے ہیں کہ پولیس اسٹیشن چھوڑ آئیں۔"

"ہونہہ۔ فضول سا تو کتا ہے" نعیم نے اپنی بزرگی کی بلندیوں سے کہا۔

وسیم نے جیب سے ایک چرایا ہوا بسکٹ نکال کر کتے کو دکھایا کتا فوراً پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو

کر اسے لینے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کی بھوری آنکھوں میں شرارت کی چمک تھی اور گلابی زبان باہر نکالے وہ سخت مسخرہ لگ رہا تھا۔ نعیم بھی کچھ متاثر ہو گیا۔

"وسیم اسے اور دو۔۔۔۔۔ ہاں یوں ذرا ہاتھ اوپر رکھو" وہ جوش میں بھر کر ہدایات دینے لگا" مجھے دو۔۔۔۔۔ ہاں چلو بھئی۔ اب لو اسے واہ شاباش نہیں ادھر رہو۔۔۔۔۔ ادھر۔ شاباش بہت اچھا کتا ہے بھئی۔ ساری بات سمجھتا ہے"۔

کوئی پندرہ بیس منٹ وہ دونوں اسی طرح کتے سے کھیلتے رہے اچانک بینا کی آواز سنائی دی وہ ادھر ہی آ رہی تھی۔

"نعیم۔ تمہارا دوست آصف آیا ہے، تمہیں بلا رہا ہے" اس نے پکارا۔

"اوہ دفع کرو اس کتے کو" یک لخت نعیم کو جیسے ہوش آ گیا۔ گھڑی دیکھتے ہوئے وہ گھبرا کر بولا۔ "میں نے تو آصف سے پکچر کا وقت مقرر کر رکھا تھا۔ اس کم بخت کی وجہ سے پتہ نہیں وقت پر پہنچ سکتے ہیں یا نہیں۔۔۔۔۔" پھر رک کر بولا" وسیم۔ کیا تم اس کتے کو پہنچا دو گے۔۔۔۔۔؟ مجھے دیر ہو رہی ہے۔۔۔۔۔"

"جی بھائی جان ضرور۔۔۔۔۔" وسیم نے سعادتمندی سے جواب دیا۔

نعیم نے ذرا شبہے سے اس کو دیکھا "مگر ضرور پہنچا دینا اسے۔۔۔۔۔ نہیں تو ابا جان ڈانٹیں گے۔۔۔۔۔"

آصف کی آواز آئی۔ وہ اسے پکار رہا تھا کہ دیر ہو رہی ہے جلدی آؤ۔

"اچھا وسیم۔ میں جا رہا ہوں" نعیم نے جاتے ہوئے کہا۔ "اور تم اسے ضرور پولیس سٹیشن پہنچا دینا۔۔۔۔۔"

نعیم کے جانے کے بعد وسیم اپنے وعدے کے مطابق جولی کو لے کر ایک بار پھر پولیس سٹیشن کی طرف چل دیا۔

شام گہری ہو رہی تھی۔ اور جولی مزے سے دلکی چال چلتا اس کے پیچھے آ رہا تھا۔ وسیم کے ابرو گہرے غور و فکر کے باعث آپس میں جڑے ہوئے تھے۔ اسے پتہ بھی نہ چلا جو چانک آواز آئی۔ وسیم نے اوپر دیکھا جواد اپنی تیر کمان لیے کھڑا تھا۔

"تمہاری تیر کمان کہاں گئی؟ انکل نے لے لی" اس نے ہمدردی سے پوچھا۔

وسیم اداسی سے اسے دیکھتا رہا۔ آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ایک نیا خیال اس کے ذہن میں آیا تھا۔

دیکھو جواد۔ اگر آدھے دن کے لیے میں تمہیں ایک کتا کھیلنے کے لیے دوں تو تم اس کے

بدلے میں مجھے اپنی تیر کمان دے دو گے؟"

"مگر کتا کہاں ہے" جواد نے ادھر ادھر دیکھ کر پوچھا۔ "یہ رہا" وسیم نے جولی کی طرف اشارہ کیا۔ جو ابھی ابھی ایک گڑھے سے کود کر نکلا تھا" میں ذرا پولیس سٹیشن تک جا رہا ہوں مگر یہ پیچھے آتا ہے۔ اگر تم اسے پکڑ کر ہمارے والے کھنڈر میں بند کر دو تو روزانہ ایک دن میں اس سے کھیلوں گا۔ ایک دن تم کھیلنا۔ ٹھیک ہے؟"

جواد کچھ دیر کھڑا سوچتا رہا۔ پھر سر ہلا کر بولا۔ "ٹھیک ہے" وسیم سیدھا پولیس سٹیشن چلا گیا۔ یہ مڑ کر دیکھے بغیر کہ کتا پیچھے آ رہا ہے کہ نہیں۔ ویسے وہ آ بھی نہیں رہا تھا۔ اس لیے کہ جواد اسے اٹھا کر باغیوں کے ہیڈ کوارٹر میں بند کرنے لے گیا تھا۔

رات کو سونے سے پہلے نعیم اس کے پاس آیا۔

ہاں بھائی جان۔ میں اسے لے کر پولیس اسٹیشن گیا تو رستے میں پیچھے مڑ کر دیکھا تو کتا غائب تھا۔ بہت ڈھونڈا مگر نہیں ملا"۔

"خیر۔ یہ سن لو۔ اگر وہ کتا دوبارہ اس گھر میں آ گیا تو میں اسے گولی مار دوں گا۔" نعیم نے دانت پیس کر دھمکی دی اور دروازہ بند کر کے چلا گیا۔

اس کے دو دن بعد وسیم اپنے ہیڈ کوارٹر میں ٹوٹے ہوئے کریٹ پر بیٹھا' دونوں ہاتھوں میں ٹھوڑی تھامے' سامنے کھڑے جولی کو پر خیال نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے پاس ہی زمین پر ایک لفافے میں روٹی کے باسی ٹکڑے' ایک ہڈی اور ہنٹر بیف کا نصف پارچہ پڑا تھا۔ یہ چیزیں حاصل کرنے کے لیے اسے بڑی تگ و دو کرنی پڑی تھی۔ مگر آج جولی سے کھیلنے کی باری اس کی تھی لہٰذا اس کا راشن بھی اس کے ذمے تھا۔ کل جواد جولی سے کھیلے گا اور وہ تیر کمان سے شکار کرے گا۔ اس روز یہی طے پایا تھا۔ جس پر اب تک بڑی دیانت داری سے عمل ہو رہا تھا۔ یونہی سوچتے سوچتے وسیم کو الماری میں پڑی تیر کمان کا خیال آیا۔ اور وہ اداس ہو گیا۔ کیا کوئی ایسی ترکیب نہ ہو سکتی تھی جو وہ اپنی پیاری تیر کمان کو وہاں سے نکال سکتا۔ اس نے بہتر تجویزیں سوچیں مگر کوئی بھی نہ جچی۔۔۔۔۔۔ آخر تنگ آ کے اس نے یہ خیال ہی چھوڑ دیا۔ اپنے گہرے غور و خوض میں اس نے وہ آدمی نہ دیکھا تھا جو قریباً پندرہ منٹ سے آدھے بھڑے ہوئے دروازے کے ساتھ لگا کھڑا اسے بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔۔۔۔۔۔

اس آدمی کا حلیہ عجیب تھا۔ بڑے بڑے بال۔ ڈھیلا ساکوٹ اور ڈھیلی سی پتلون پہنے وہ کوئی آرٹسٹ یا شاعر لگتا تھا۔ اچانک وسیم کی نظریں اس پر پڑی تو اس نے تیوری چڑھالی۔

"ننھے میاں" آدمی مسکرا کر اندر آتے ہوئے بولا۔ "کیا تم مجھے بتا سکو گے کہ تم ابھی کیا

سوچ رہے تھے۔" قطعی سنکی تھا یہ آدمی بھی۔

وسیم نے اسے مشکوک نظروں سے دیکھا اور چپ رہا۔ اتنے میں باہر سے کسی لڑکی کے پکارنے کی آواز آئی۔

"ابو۔۔۔۔۔۔ابو" وہ اندر آئی تو جولی پر نظر پڑتے ہی چلائی "ابو - یہ ہمارا جولی ہے۔ یہ یہاں کیسے آ گیا۔" پھر وسیم کی طرف مڑی "اچھا یہ لڑکا چرا کر لایا ہو گا۔"

جولی بھاگ کر لڑکی کی طرف بڑھا۔ پھر کچھ سوچ کر واپس آ گیا اور وسیم کے قدموں میں بیٹھ کر دم ہلانے لگا۔ اس پر آدمی نے قہقہہ لگایا۔۔۔۔۔۔

"دیکھا نینو!۔۔۔۔۔۔ جولی اب اس لڑکے سے مل گیا ہے۔"

وہ تمہارے پاس نہیں آئے گا اب"۔

"مگر یہ ہمارا ہے۔۔۔۔۔۔" لڑکی مچل گئی۔

"ننھے میاں۔ جولی دراصل ہمارا کتا ہے۔" آدمی نے مسکرا کر کہا۔ "دو روز ہوئے گم ہو گیا تھا۔ آج یہاں ملا ہے اچھا یہ بتاؤ اس کا نام ٹھیک رکھا ہے نا ہم نے۔ یہ واقعی جولی ہے نا۔۔۔۔۔۔" خوش خلق اور ہنس مکھ؟

وسیم کی طرف سے جواب نہ پا کر وہ بولا۔ "اور میرا نام کاظمی ہے سعد کاظمی۔ میں آرٹسٹ ہوں۔ اس سامنے والی ہٹ میں ہم لوگ آئے ہیں۔ اور یہ میری بیٹی نینوں ہے"

جولی ابھی تک دم ہلا ہلا کر وسیم کو مشتاق نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"میں نے اسے چرایا بالکل نہیں" وسیم کو اپنی توہین پر جو غصہ آیا تھا۔ وہ اتنی بے تکلف گفتگو کے بعد بھی نہ اتر سکا۔ "یہ خود ہی میرے پیچھے چلا آیا تھا۔ میں نے اسے بھگانے کی بہت کوشش کی مگر یہ بھاگا ہی نہیں" پھر یک لخت ایک دہشت ناک خیال اس کے دماغ میں آیا۔ اور اس نے پوچھ ہی لیا۔ "اب آپ اسے لے لیں گے۔؟"

"نہیں اگر تمہارا دل چاہتا ہے تو تم اسے رکھ لو" نینو نے بڑی فراخ دلی سے کہا" ویسے بھی ہم اس کتے سے اکتا گئے تھے۔ ہیں نا ابو۔ میں تو اب ایک پیارا سا پامیرین کتا لوں گی۔ جولی نہایت بدتمیز ہے۔ ذرا بھی پونٹ نہیں" اس نے منہ بنا کر کہا" مجھے ایسے جنگلی کتے بالکل پسند نہیں" نہایت شستہ اور کلچرڈ لڑکی تھی وہ۔۔۔۔۔

"پھر میں اسے تھوڑی دیر رکھ لوں؟" وسیم نے اشتیاق سے پوچھا۔

"بالکل" لڑکی نے اپنے رول کیے ہوئے بال جھلا کر کہا۔ "مجھے تو خاموش سے کتے پسند ہیں۔ جولی کی طرح پر شور کرنے والے نہیں۔۔۔۔۔۔ تم ہماری ہٹ میں آؤ گے؟ بالکل نزدیک

ہی ہے۔۔۔۔۔"

اور وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اچھلتی کودتی ہٹ کی طرف چل پڑی۔ پیچھے پیچھے اس کے ابو کاظمی صاحب تھے۔ ان کے ہونٹوں پر ایک بے حد۔ مادرانہ سی مسکراہٹ تھی۔ وہ قطعی ایک بڑے آرٹسٹ لگ رہے تھے۔

نینو دس گیارہ سال کی ایک نہایت خود آگاہی لڑکی تھی۔ اس نے اپنے ابو کے ساتھ پاکستان کے بیشتر بڑے شہر دیکھ رکھے تھے۔ جہاں بھی ان کی تصاویر کی نمائش ہوتی وہ ضرور ہمراہ جاتی۔ اپنی والدہ کے انتقال کے بعد سے ابو کا سارا لاڈ پیار وہ اپنے لیے وقف سمجھتی تھی۔ کانونٹ میں پڑھتی تھی۔ اور سارے ماڈرن ڈانس اسے آتے تھے۔

"تمہیں ڈھاکہ پسند ہے" چلتے چلتے اس نے وسیم سے پوچھا۔ جو بار بار پیچھے مڑ کر دیکھ رہا تھا کہ جولی آرہا ہے یا نہیں۔

"آں:" اس نے غائب دماغی سے کہا۔ "میں وہاں کبھی نہیں گیا۔" نینو نے پھر اپنے بال جھلائے اور ہنس پڑی۔

"ارے تمہیں تو بنگالی بھی نہیں آتی ہوگی؟"

"نہیں۔۔۔۔۔" وسیم نے تیوری چڑھا کر کہا۔ اور سیٹی بجا کر جولی کو بلانے لگا۔ جو ایک خرگوش کے پیچھے جھاڑی میں گھسنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"اچھا بتاؤ۔ تمہیں ٹوسٹ آتا ہے؟" نینو نے پوچھا۔

"اونہوں۔۔۔۔۔ میں نے کبھی کر کے ہی نہیں دیکھا"۔

"ایسا ہوتا ہے ٹوسٹ" اس نے نمونتہ" تھوڑے سے بل کھائے۔

"بالکل آسان ہوتا ہے۔ تم ہمارے گھر آنا۔ میں تمہیں سکھا دوں گی"۔

"میں نہیں سیکھوں گا" وسیم نے زور دار انداز سے سر ہلاتے ہوئے کہا کہ اس کی پیشانی پر شکنیں تھیں۔ "شکریہ"۔

نینو ہنسی سے دہری ہو گئی۔ "ابو۔ یہ کیسا لڑکا ہے" وہ چلائی "نہ تو اسے بنگالی آتی ہے۔ نہ کبھی ڈھاکے گیا ہے۔ اور اب کہتا ہے میں نہیں سیکھوں گا ڈانس۔ ہے عجیب بات۔ ایک دم رف ہے یہ۔۔۔۔۔ بالکل جولی کی طرح۔ تبھی تو اسے جولی پسند آیا ہے۔" کاظمی صاحب بے ساختہ ہنس پڑے۔

اب ان کی ہٹ آگئی تھی۔ وہ اندر چلے گئے۔

"بھئی تم چاہے کچھ کہو۔ میں تمہیں ٹوسٹ اور چاچا ضرور سکھاؤں گی۔ کتنے فنی لگو گے۔

"تم ڈانس کرتے ہوئے۔"

نینو اب بھی ہنس رہی تھی۔ اچھا یہ بتاؤ کبھی سرینا حسین کو دیکھا ہے" اس نے اپنی ذہنی برتری کا مزید مظاہرہ کرتے ہوئے وسیم کا مذاق اڑایا۔"

"نہیں۔۔۔۔۔" وسیم نے جھلا کر کہا "میں ایسے لوگوں سے کبھی نہیں ملا۔۔۔۔۔ مجھے نہیں پتہ وہ کون ہے"

وہ ہنسی سے بل کھاتی اپنے باپ کے پاس صوفے پر جا بیٹھی جو بڑی دلچسپی سے دونوں کی نوک جھونک دیکھ رہے تھے۔

"ننھے میاں ذرا خبردار رہنا" انہوں نے ہنس کر کہا۔۔۔۔" یہ نینو تمہاری استانی بننے کی کوشش کرے گی۔ میں اسے خوب جانتا ہوں۔"

وسیم منہ پھلا کر خاموش ہو رہا۔

"اچھا اب ذرا ایک کام کرو۔ میاں" کاظمی صاحب نے اٹھتے ہوئے کہا۔۔۔۔ "ذرا میرے سٹوڈیو میں آجاؤ۔ اور نام کیا ہے تمہارا برخوردار؟"

"وسیم۔۔۔۔۔"

"اچھا وسیم میاں تم اس سٹول پر بیٹھ جاؤ۔" انہوں نے سٹوڈیو کا دوسرا اسٹول گھسیٹ کر اس پر خود بیٹھتے ہوئے کہا "اور ذرا وہی باتیں سوچو جو ابھی اس کھنڈر میں بیٹھے سوچ رہے تھے۔ ہاں شاباش اس کے بدلے تم جو کہو گے دوں گا۔ ہاں اسی طرح ٹھوڑی دونوں ہاتھوں میں لے کر۔ یوں۔ شاباش اسی طرح بیٹھے رہو۔"

نینو اس قسم کے مواقع پر اکثر کھسک جایا کرتی تھی وہ بڑی عقلمند لڑکی تھی۔۔۔۔ وسیم خاموشی سے یونہی بیٹھا رہا۔ اور کاظمی صاحب کا ہاتھ کینوس پر تیزی سے چلتا رہا۔ نہایت "زود نویس" قسم کے آرٹسٹ تھے وہ۔

اور جب کوئی ایک گھنٹے بعد وسیم لوٹا تو نینو اپنے ابو کے ساتھ اسے رخصت کرنے دروازے تک آئی۔

"تم روز آیا کرو۔ مجھے تم بہت اچھے لگتے ہو۔" وہ بولی۔

اگلے روز جب کاظمی صاحب ڈرائنگ روم میں بیٹھے ابا سے گپیں مار رہے تھے تو وسیم کی طلبی ہوئی۔

"بیٹے اب بتاؤ اس پوز کے لیے تم کیا لو گے؟ کاظمی صاحب وعدے کے بڑے پابند نکلے۔

وسیم کچھ دیر کھڑا سوچتا رہا۔ پھر آہستہ سے سر اٹھا کر ابا کو دیکھا اور فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ "اپنی تیر کمان--- ابا جان نے میری تیر کمان لے کر بند کر دی ہے۔ مجھے وہ واپس چاہیے۔" کاظمی صاحب نے فلک شگاف قہقہہ لگایا اور بولے۔

"کلیم صاحب میری شرم رکھ لیجئے۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اس قیمتی پوز کے بدلے جو چاہے مجھ سے مانگ لے۔ اب اس کی تیر کمان دے کر مجھے اس کے سامنے سرخرو کیجئے۔"

اور کلیم صاحب نے چپکے سے الماری کھول کر تیر کمان وسیم کے حوالے کی۔

"بس اب ہم سب کے آرام و سکون کا خدا حافظ۔" وہ زیر لب بولے۔

سہ پہر کی چائے کے بعد وسیم اپنی تیر کمان لے کر شہزادوں کی سی شان سے نکلا۔ غروب ہوتے ہوئے سورج نے بادلوں میں سونا گھول رکھا تھا۔ اور دور افق میں دھند سی چھائی ہوئی تھی۔ ہلکی ہلکی خنک ہوا میں اس کے بال اڑ رہے تھے۔ مارچ کی اس فسوں خیز شام کو ننھے ننھے پرندوں نے پیڑوں میں شور مچا رکھا تھا۔ ہر طرف آنے والی بہار کے قدموں کی چاپ تھی۔ درختوں میں نئے شگوفے پھوٹ رہے تھے اور ہواؤں میں عنبر جیسی مہک تھی۔

اور اس حسین شام کا ایک حصہ بن کر وسیم میاں سڑک پر چلے جا رہے تھے۔ تیر کمان کندھے سے لٹکا رکھی تھی۔ چہرہ مسرت و شادمانی سے تمتما رہا تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے ہر ہر قدم پر کچھ سونگھتا اور گاہے بھونکتا' گاہے لپکتا جولی تھا۔ جو نینو نے اسے "مستقبل" ہی بخش دیا تھا۔ وسیم کی مسرت کی آج کوئی انتہا نہ تھی۔ مستقبل سورج کی طرح اس کے سامنے دمک رہا تھا۔

اس سال آرٹ گیلری میں ایک بچے کی تصویر نے دھوم مچا دی۔ یہ ایک ایسے بچے کی پیاری سی تصویر تھی۔ جو دونوں ہاتھوں میں چہرہ لیے---- ٹوٹے ہوئے چوبی بکس پر بیٹھا' ایک کتے کو پر خیال نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ اس کے چہرے پر عجیب سی معصومیت آمیز آزردگی تھی۔ یہ تصویر اس آرٹس گیلری کی جان قرار پائی۔ اور اس کے بنانے والے مسٹر کاظمی کو گراں قدر انعام دیا گیا۔ لیکن جب مسز کلیم نے سب کے اصرار پر یہ تصویر جا کر دیکھی تو پسند کرنے کے باوجود کہنے لگیں مجھے آرٹسٹ سے ایک شکایت ہے کہ انہوں نے اپنے معجز نما برش سے کام لے کر اس کے بال ذرا اور سنوار دیے ہوتے تو ان الجھے ہوئے بالوں میں جس طرح جنگلی نظر آ رہا ہے اس وضع میں کچھ فرق پڑ جاتا۔